کے دوران ستار خریدا تھا اور کسی خاص استاد سے مہارت بھی حاصل کی تھی۔ علامہ اپنی عمر کے آخری حصّے تک ستار سے محظوظ ہوتے رہے۔ علامہ اقبالؔ کو نغموں اور مجروں سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ اُن دنوں اُردو اور فارسی اساتذہ کی غزلیات آلات موسیقی کے ساتھ گائی جاتی تھیں اور یہ محفلیں خوبصورت جوان عورتوں سے سجی رہتی تھیں۔ تاریخی حوالوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اقبالؔ بعض اوقات ان محفلوں میں شرکت کرتے تھے اور چونکہ وہاں رقص اور مے گساری کے بساط بھی سجے ہوتے تھے اس لیے بعض افراد کے لیے یہ تصوّر کرنا ناممکن تھا کہ علامہ وہاں صرف نغمات سننے کے لئے جاتے تھے اور مے گساری اور دوسری لغویات سے اُن کو کوئی سروکار نہ تھا۔ جب کبھی علامہ اپنے دوست خواجہ حسن نظامی کے پاس مہمان ہوتے تو خواجہ صاحب اقبالؔ کے لیے قوالی کی محفل ضرور سجاتے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اقبالؔ صمیم قلب سے قوالی کے دلدادہ ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ اقبالؔ تھیٹر شو میں بھی شرکت کرتے چنانچہ آغا حشر کشمیری کا شو جب لاہور میں لگایا گیا تو اقبالؔ اُس کو دیکھنے کے لیے دوستوں کے ساتھ گئے۔ محمد عثمان اپنی تالیف میں لکھتے ہیں کہ اقبالؔ یورپ سے واپس ہونے کے بعد یعنی ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۱ء تک بڑے اضطراب اور روحی و جسمی کشمکش میں مبتلا تھے اور اُن کا دل ایک تشنۂ محبت تھا جس کی وجہ اُن کا عشق ناکام تھا۔ مسعود الحسن اقبالؔ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان عطیہ فیضی اور اقبالؔ نے شادی کرنے کی تصمیم کی لیکن عطیہ فیضی کے ہندوستان آنے کے بعد اُس کی تیز طبیعت نے اقبالؔ کو شادی سے منحرف کر دیا چنانچہ ۱۹۱۲ء میں عطیہ نے رحمان سے شادی کر لی اِسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبالؔ نے ۱۹۱۵ء کے بعد رومانٹک اشعار جیسے ''کی گود میں بلّی دیکھ کر''، ''پھول کا تحفہ وصول ہونے پر''، ''وصال'' ''حسن عاشق'' اور ''نوائے غم'' نہیں لکھے۔ اگرچہ عطیہ فیضی نے اپنی کتاب اقبالؔ میں لکھا ہے کہ اقبالؔ کبھی بھی رومانٹک شاعر نہیں رہے۔

عبدالمجید سالکؔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ علامہ شوخ، ہنس مکھ، حساس، اور خوش گذاراں تھے۔ جوانی کے زمانے میں گاہی اوقات رقص اور آواز کی محفلوں میں شرکت کرتے لیکن مے گساری سے نفرت رکھتے تھے اور اُس زمانے میں اُن کی مالی حالت کمزور تھی اور ان پُرخرچ چیزوں کو تحمل نہیں

کر سکتے تھے۔ چونکہ اقبالؔ بہت شوخ اور بذلہ سنج تھے اور بعض اوقات طنزیہ شراب خوری کا ذکر اور مذاق اُڑاتے تھے اس لیے کم فہم اور عام لوگ جن میں جاہل مولوی سرفہرست تھے مذاق کو حقیقت تلقین کرتے تھے۔ ہم اس مضمون میں دو تین مستند واقعات نقل کریں گے جو ہمارے مطالب کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔

کتاب آئینہ اقبالؔ میں عبدالہ قریشی لکھتے ہیں کہ ایک دن اقبالؔ کے دوست دین محمد فوق اقبالؔ سے ملنے کے لئے آئے۔ اقبالؔ اُس وقت اپنے کتب خانے کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ کتابوں کو الٹ پلٹ رہے تھے۔ فوق نے اقبالؔ سے پوچھا۔ کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ اقبالؔ نے فوراً جواب دیا ایک بوتل انگور کی شراب کی کتابوں کے پیچھے چھپایا تھا اُسے ڈھونڈ رہا ہوں کیوں کہ کل شمس العلما مفتی عبداللہ ٹونکی میرے پاس آئے تھے، کہیں مفتی صاحب اُسے اٹھا کر نہ چلے گئے ہوں۔ روایات اقبالؔ میں عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ ایک بار میاں شاہ دین نے اپنے گھر ایک محفل ضیافت سجائی اور انگریز مہمانوں کے خورد و نوش کے لیے علیحدہ کمرے میں انتظام کیا تھا۔ خود میاں شاہ دین دروازے پر مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ جب میاں صاحب نے اقبالؔ کو مرزا جلال الدین کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر کہا کہ میں نے آپ دونوں کے لیے علیحدہ کمرے میں انتظام کیا ہے۔ اقبالؔ نے ہنس کر کہا ہم نے آپ سے صرف دو حرف سیکھے ہیں۔ ایک یہ کہ چھپا کر پیو اور دوسرے اپنے گناہ میں کسی کو شریک نہ کرو۔ اس طرح کے کئی شوخیانہ اور طنزیہ جملوں کی سُن کر دشمن اور کینہ صفت افراد نے اقبالؔ کو بے گسار ثابت کرنے کی کوشش کی جس کا اثر کچھ اقبالؔ کے نادان حامیوں پر بھی پڑا چنانچہ عبدالمجید سالکؔ نے ذکر اقبالؔ میں صفحہ (۱۷) میں لکھا ہے کہ اقبالؔ جوانی کے زمانے میں شراب پیتے تھے لیکن بعد میں اس کام سے توبہ کر لی اور پھر کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ عبدالمجید سالکؔ نے اپنے اس ادعا کے ذیل میں ۱۹۱۸ء کے ایک مشاعرے کا ذکر کیا جو لٹن لاج میں برگزار ہوا تھا۔ اقبالؔ اس مشاعرے میں سب سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ اقبالؔ نے سالکؔ کو دیکھ کر کہا کہ حقہ لاؤ۔ سالکؔ نے جواب دیا ڈاکٹر صاحب حقہ آپ کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ اقبالؔ نے مسکرا کر کہا کہ ''دوست عزیز شراب تو چھوڑ چکا ہوں اور اب

چاہتے ہو کہ حقہ بھی چھوڑ دوں''۔ سالکؔ لکھتے ہیں کہ اس جملہ کا کوئی شاہد اور گواہ نہیں ہے کیونکہ اقبالؔ نے جب یہ جملہ کہا اُس وقت صرف میں ہی موجود تھا۔ بہر حال جس جملہ کا کوئی گواہ اور شاہد نہ ہو اور دوسری طرف ایک شوخیانہ طبیعت جو ہزار اشاروں میں بات کرنے کا فن جانتی ہے تو اہل فکر کے نزدیک یہ مسئلہ خود بہ خود مشکوک اور بے اساس ہو جاتا ہے۔ غلام مصطفیٰ تبسم اور عبدالمجید سالکؔ نے فارسی کے چند اشعار جو ''رموز بے خودی'' میں شراب اور عشق کے معنی میں آئے ہیں انھیں اقبالؔ کی شراب نوشی کے اعتراف کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر شراب تخیل، شراب طہورہ، جام تصوّف، بادہ عرفان، مستی بے خودی، اور قلندری کو شراب خوری کی سند تصور کیا جائے تو کوئی بڑا اور چھوٹا صوفی شاعر اس اتہام شراب خوری سے بچ نہیں سکتا اگر چہ وہ عطارؔ، سعدیؔ، مولویؔ، حافظؔ، خسروؔ، اور میر تقیؔ میر کیوں نہ ہو۔ جو اشعار اقبالؔ کی مے گساری کے ذیل میں پیش کیے گئے ہیں اُن میں یہ اشعار قابل ذکر ہیں۔

مدتی بہ لالہ رویان ساختم عشق با مرغولہ مویان باختم
بادھا با ماہ سیمایان زدم بر چراغ عافیت دامان زدم
این شراب از شیشۂ جام نریخت ایں ذر را ز دامنم نریخت

یعنی میں بڑی مدت تک گل رخوں کے ساتھ رہا اور اُن سے میں نے عشق میں شکست کھائی۔ میں نے چاند صورتوں کے ساتھ شراب پی اور اپنی عافیت کے چراغ بجھانے کی کوشش کی۔ اس شراب کو مری جان کے شیشے سے خالی مت کر اور طلا کو میرے دامن سے مت پھینک۔

اگر ان اشعار کو شراب نوشی کی سند کہا جائے تو فارسی اور اُردو شعرا جن کی پارسائی مشہور ہے ان کے دفتر اس طرح کے اشعار سے بھرے پڑے ہیں اور اس طرح سے کوئی شاعر مے گساری کی تہمت سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ صرف یہی نہیں کہ اقبالؔ شراب خور نہ تھے بلکہ اقبالؔ کو شراب خواری سے نفرت تھی جس کا پتہ ہم کو اُس حکایت سے ملتا ہے کہ جس میں علامہ نے جاوید اقبالؔ کی وجہ سے اپنے خادم علی بخش کو معاف کر دیا تھا۔ علامہ کی وفات سے کچھ مہینے قبل ایک سکھ علامہ سے ملنے کے لیے آیا اُس وقت علامہ ایک عرب قاری کی تلاوت سماعت فرما رہے تھے۔ علی بخش نے سکھ کو علامہ تک پہنچایا اور وہ علامہ

سے کچھ دیر بات چیت میں مصروف رہا پھر کمرے سے باہر نکل کر علی بخش سے کہا کہ ٹانگے میں جو بوتل اور گلاس ہے اُسے لے آؤ۔ علی بخش نے سکھ کے احترام میں یہ کام انجام دیا۔ سکھ نے صحن میں کرسی پر بیٹھ کر شراب خوری شروع کر دی۔ پندرہ بیس منٹ بعد علامہ نے علی بخش سے پوچھا کہ سردار صاحب کہاں ہیں۔ علی بخش نے جواب دیا کہ صحن میں بیٹھ کر شراب پی رہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ علامہ کا چہرا غصہ سے لال ہو گیا فوراً اُسی حالت میں کمرے سے نکلے اگرچہ سخت بیمار اور کمزور ہو چکے تھے لیکن بوتل کو زمین پر مار کر توڑ دیا اور سکھ کے گریباں پکڑ کر گھر سے باہر کر دیا۔ جاوید اقبال راقم ہیں کہ علامہ کی غصہ کی آواز سن کر میں صحن میں آیا اور میں نے دیکھا کہ علامہ علی بخش پر غصہ کر رہے ہیں کہ کیوں گھر میں شراب پینے کی اجازت دی۔ بہر حال کچھ دنوں خفا رہنے کے بعد جاوید اقبال کی سفارش پر علامہ نے علی بخش کو معاف کر دیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص خود شرابی ہو یا پہلے شراب پی چکا ہو تو کیا وہ اس قسم کا عمل کر سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب ہر ذی شعور انسان دے سکتا ہے۔

علامہ اقبال ہمیشہ تقوی اور پارسائی کے بجائے رندی اور خوش گذارنی کی شہرت کو پسند کرتے تھے لیکن اُن کے قریبی دوست اُن کے ہر عمل اور فعل سے واقف تھے چنانچہ کسی بھی قریبی دوست نے اُن کی شراب خوری کا ذکر یا اُس کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ ۱۳/اکتوبر ۱۹۱۶ء کو مہاراجہ کشن پرشاد جو نظام حیدر آباد کے وزیر آعظم تھے اور ہندو تھے اپنے شخصی خط میں لکھتے ہیں "ہر روز صبح تین بجے اور بعض اوقات چار بجے اٹھ جاتا ہوں اور پھر نہیں سوتا، اگرچہ بعض اوقات جانماز پر ہی بیٹھے بیٹھے سو جاتا ہوں"۔ چونکہ علامہ نام نہاد کم علم جاہل ملاؤں سے الرجک تھے اور انھیں اسلام کے دامن پر داغ اور اسلامی شریعت کے لیے نقصان رساں سمجھتے تھے اس لیے ان کو آگ بگولہ کرنے کے لیے ہمیشہ شوخیاں کرتے جن کی تفصیل زیادہ ہے ہم یہاں صرف چند واقعات پیش کریں گے۔ عبدالمجید جواہر اقبال میں لکھتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب جو پروفیسر آرنلڈ سے علیگڑھ کالج سے متعارف تھے سیر و سیاحت کے لیے لندن پہنچے۔ پروفیسر آرنلڈ نے اقبال سے خواہش کی کہ مولوی صاحب کو لندن کی مکمل سیر کروائیں۔ علامہ نے مولوی صاحب کو تمام روز لندن کی سیر کروائی اور پھر شام کو ایک ریسٹورنٹ لے

گئے جہاں چند ناچنے والی لڑکیوں نے مولوی صاحب کو گھیر لیا۔ کسی نے ناز و عشوہ سے قہوہ پلایا، کسی نے ڈاڑھی پر دست نوازش پھیرا اور کسی نے مولوی کے چہرے پر لپ اسٹک کا نشان چھوڑ دیا جس پر مولوی صاحب بہت بگڑے اور آرنلڈ سے اقبالؔ کی شکایت کی۔ جب آرنلڈ نے اقبالؔ سے اس کی وجہ پوچھی تو اقبالؔ نے کہا کہ میں نے آپ ہی کے کہنے کے مطابق مولوی صاحب کو لندن کی زندگی کے دونوں رخ دکھائے تاکہ مولوی صاحب کو سکّہ کے دونوں رخوں کا علم ہو سکے۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ابولیث صدیقی نے ملفوظات اقبالؔ میں لکھا ہے کہ جب اقبالؔ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کنفرانس میں شرکت کی غرض سے لکھنو گئے تھے وہاں جب شام کو اقبالؔ کسی محفل نغمہ و رقص میں پہنچے تو وہاں ایک مولوی صاحب بھی پہلے سے موجود تھے جو فوراً اقبالؔ کو دیکھ کر فرار ہو گیے لیکن اپنا شناختی کارڈ بھول گئے۔ جس کو علامہ نے ایک نامہ کے ذریعے صدر کانفرنس کے توسط سے مولوی صاحب تک پہنچایا جس میں لکھا تھا کہ ''چونکہ میرے پاس مولوی صاحب کا ایڈرس نہیں ہے اس لیے یہ شناختی کارڈ آپ کے توسط سے پہنچا رہا ہوں جسے مولوی صاحب نے محفل نغمہ و رقص میں چھوڑ دیا تھا''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ جوانی میں بڑے زندہ دل جوان تھے۔ خطوط اقبالؔ میں شیخ عطا اللہ لکھتے ہیں کہ سیالکوٹ میں ایک طوائف امیر بیگم بہت خوبصورت اور اچھے گانے والوں میں شمار کی جاتی تھی۔ یہ اردو اور فارسی کے اساتذہ کی غزلیات بڑے خاص انداز سے سُناتی تھی اور علامہ بعض اوقات اس کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے چنانچہ استاد میر حسن کے بیٹے سید تقی شاہ جو اقبالؔ کے بچپن کے دوست تھے اُن کو ۱۹۰۳ء کو خط میں لکھتے ہیں ''امیر بیگم کہاں ہے۔ آپ براہ کرم اُس کے پاس جا کر میری طرف سے اُس کی احوال پرسی کریں اور کہیں کہ اقبالؔ بہت مضطرب ہے جتنا اُس سے فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے احساس کر رہا ہوں کہ اُس سے نزدیک ہوتا جا رہا ہوں''۔

اس کے علاوہ علامہ اور عطیہ فیضی کے تعلقات اگرچہ پاک اور دوستانہ تھے لیکن بہر حال دونوں میں محبت اور ایک دوسرے کے دل میں جگہ ضرور تھی۔ بعض کتابوں میں علامہ اقبالؔ کی ایک دولت مند اینالوی لڑکی ''رامی'' سے دوستی کا ذکر بھی ملتا ہے جو اقبالؔ سے انگلستان میں ملی اور اُس کی وجہ سے علامہ

نے اٹلی کی سیر کی اور موسولینی سے ملاقات کی۔ علامہ اقبالؔ کے کئی خطوط جو عشقیہ ہیں مس ویگے ناسٹ کے نام بھی ہیں۔

محمد دین تاثیر اپنے مقالہ رجال اقبالؔ ۱۹۵۱ء میں لکھتے ہیں کہ ''علامہ اقبالؔ اپنی نفسانی خواہشوں پر مکمل تسلط رکھتے تھے۔ میں مطمین ہوں کہ وہ کوئی چیز ہم سے پنہاں نہیں رکھتے تھے۔ ہر چیز کا وہ مجھکو واضح جواب دیا کرتے تھے کیوں کہ ہم جس چیز کو رندی تصور کرتے تھے وہ شراب خوری نہ تھی بلکہ رندی حرف اور فکر کی تھی اور یہ چیز پنہاں کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اقبالؔ کو ولی نہیں کہتا لیکن وہ عاشق رسولؐ اور خادم اولیا ضرور تھا۔ وہ نماز دار اور نماز شب گذار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے اخلاق اُن مسلمانوں میں جو انگریزی تہذیب کے پروردہ اور دلدادہ ہیں بہت کم دیکھے جاتے ہیں۔ خالد نظر صوفی کی تالیف ''اقبالؔ گھر میں''، شیخ احمد کے توسط سے لکھتے ہیں کہ میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء تک کئی بار اقبالؔ کے گھر گیا اور کئی بار اُس میں قیام بھی کیا لیکن میں نے کبھی اقبالؔ کو شراب نوشی یا شراب کے نشے میں نہین دیکھا اور نہ کبھی شراب خوری کے بساط ان کے گھر میں دیکھے۔ اگر وہ شراب کے معتاد تھے تو وہ شراب خوری اور وسائل شراب خوری کو پنہاں نہیں کر سکتے تھے۔ میں اپنے مشاہدات کی بنا پر اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اقبالؔ کی شراب نوشی کی داستانیں جھوٹی ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں اقبال اپنے بھائی کے مقدمہ کے سلسلے میں شہر اٹک جہاں پر اُن کے کسی وکیل دوست نے ضیافت کی پارٹی رکھی اور اس میں انگریزی مہمانوں کے لیے شراب خوری کا انتظام کیا۔ شیخ اعجاز احمد کی عمر اُس وقت ۱۳ سال تھی اور وہ علامہ کے ہمراہ تھے۔ اعجاز احمد کہتے ہیں جب میزبان نے علامہ اقبالؔ کو جام شراب پیش کیا اور اصرار بھی کیا تو علامہ نے فرمایا ''یہ چیز جو یورپ میں پانی کی طرح مہیا تھی اور اُس کو میں نے ہاتھ نہیں لگایا اب کیسے منہ لگا سکتا ہوں''۔ علامہ کے فرزند جاوید اقبال جو ہمیشہ اقبالؔ کے ساتھ رہے لکھتے ہیں کہ میں نے علامہ کو حقہ پیتے ہوئے تو دیکھا لیکن کبھی شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی شراب کے بساط اور لوازم کو گھر میں دیکھا۔ اقبالؔ کا گھر جو محلہ انارکلی میں تھا اس میں علامہ کی دو بھتیجیاں بھی زندگی بسر کرتی تھیں چنانچہ ایک بھتیجی جس کا نام حلیمہ تھا کہتی ہیں کہ ''علامہ نے کبھی شراب نہیں پی اور کبھی شراب

پینے کی طرف تمایل بھی ظاہر نہیں کیا''۔ عطیہ فیضی کے توسط سے جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ میرے عطیہ فیضی سے اُن کی آخری عمر تک تعلقات باقی رہے۔ میں اُن سے ملنے کے لیے کراچی بھی جایا کرتا تھا چنانچہ عطیہ فیضی نے بتلایا کہ انھوں نے کبھی بھی اقبال کو شراب پیتے ہوئے یا نشہ کی حالت میں نہیں دیکھا۔ علامہ اقبال کے قدیم اور صمیمی دوست جن سے اُن کی بے تکلفی اور شوخی رہتی تھی، جن میں استاد میر حسن کے فرزند سید تقی شاہ ، مدیر مخزن سید عبدالقادر، محمد دین فوق، نواب سر ذوالفقار علی خان، مرزا جلال الدین، سردار امر اُ سنگھ اور ان کے خادم علی بخش قابل ذکر ہیں، بعض احباب نے اقبال کی شخصی زندگی پر تفصیلی ریویو بھی لکھے ہیں لیکن کہیں بھی کسی نے اقبال کی مے گساری کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ان اتہامات کی سختی سے تردید بھی کی ہے۔

پنڈت شیونارائین اپنی کتاب سفرنامہ شمیم میں لکھتے ہیں کہ ریلوے اسٹیشن پر ایک شاعر جس کا نام جلال تھا ملاقات ہوئی وہ امیر مینائی کا شاگرد تھا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ میں بھی شاعر ہوں اور لاہور میں زندگی بسر کرتا ہوں تو اُس نے علامہ اقبال کے بارے میں سوالات کیے اور کہا کہ میری علامہ سے ملاقات آگرہ میں ہوئی تھی۔ سُنا ہوں کہ وہ آج کل کبوتر بازی اور خوش گذارنی میں مصروف ہیں اور شاعری و وکالت چھوڑ دی ہے۔ میں نے فوراً جواب دیا یہ سب علامہ پر اتہامات ہیں۔ علامہ روز عدالت تشریف لاتے ہیں اور آج کل اُردو سے زیادہ فارسی اشعار لکھ رہے ہیں۔ میں بعض اوقات اپنے اشعار پر اُن سے اصلاح لیتا ہوں۔ پنڈت نے مزید کہا کہ "اقبال ہندوؤں کی دولت تھے لیکن اب آپ لوگوں کے مال غنیمت ہیں جس کی آپ لوگوں کو قدر نہیں''۔

ہم اپنے مضمون کو خواجہ حسن نظامی کے اُس جملہ پر ختم کرتے ہیں جو انھوں نے ''علامہ یتیم'' سُن کر اپنے سر سے عمامہ اُتار کر اقبال کے سر پر رکھا۔ اور فرمایا۔

''میرا تقویٰ اور میری ساری پارسائی تیرے ایک لمحہ کی فکر و تخیل پر نثار''

علامہ اقبالؔ اور آفتاب اقبال

باپ اور بیٹے کے کشیدہ تعلقات کی داستان

آفتاب اقبال، علامہ اقبالؔ کے بڑے بیٹے تھے جو ۱۸۹۹ء میں پنڈ دادن خان ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی ماں علامہ کی پہلی بیوی کریم بی تھیں جن سے علامہ کی شادی ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ کریم بی کے والد ڈاکٹر شیخ عطا محمد سیول سرجن کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ کریم بی علامہ کے انتقال کے آٹھ سال بعد ۱۹۴۶ء میں گجرات میں فوت ہوئیں اور وہیں مدفون ہیں۔ کریم بی کے بطن سے علامہ کو ایک لڑکی معراج بیگم بھی ہوئی جو (۱۹) سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ اگرچہ بچپن ہی سے آفتاب اور ان کی بہن معراج اپنی ماں کے ساتھ نانا کے گھر گجرات میں رہتے تھے لیکن آفتاب، اقبالؔ کے والد نور محمدؒ کے نور نظر تھے اور نور محمد ہی نے ان کا نام آفتاب اقبال رکھا تھا۔ علامہ اقبالؔ نے آفتاب اقبال کو سکاچ مشن ہائی سکول میں شریک کروایا جہاں انھوں نے ۱۹۱۶ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا پھر سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے بی۔اے (B.A) کا امتحان بھی فلسفہ میں آنرز کے ساتھ پاس کیا اور ۱۹۲۱ء میں یم۔اے (M.A) کی ڈگری فلسفہ میں حاصل کی۔ آفتاب کے ماموں کیپٹن غلام محمد اور نانا ڈاکٹر عطا محمد نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ کیا جہاں آفتاب نے ۱۹۲۲ء میں لندن یونیورسٹی سے فلسفہ میں بی۔اے (B.A) درجہ اول میں کامیاب کیا اور پھر ۱۹۲۴ء میں اسی یونیورسٹی سے یم۔اے (M.A) کر کے دو سال کے لئے ہندوستان آئے اور پھر انگلستان جا کر تین سال تک وہاں School of Oriental Studies میں ملازم ہوئے۔ اسی دوران Lincoln Inn میں داخلہ لے کر بار ایٹ لا (Bar At Law) میں کامیابی حاصل کی لیکن مالی مشکلات کی بنا پر وکالت نہ کر سکے۔ سر اکبر حیدری نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں ملازمت دینے کی کوشیش کی لیکن کوئی مناسب جگہ ان کے لئے یونیورسٹی میں نکل نہ سکی۔ آفتاب نے کچھ عرصے کے لئے اسلامیہ کالج لاہور میں بحیثیت صدر شعبہ انگریزی ملازمت کی لیکن ۱۹۴۲ء میں بہ حیثیت بیرسٹر پریکٹس شروع کی اور

پاکستان کے قیام کے بعد وہ مستقل طور پر کراچی منتقل ہو گئے اور بیرسٹری پریکٹس میں آخری عمر تک مصروف رہے اور یہیں پر رشیدہ بیگم سے شادی کی۔ آفتاب اقبال کا (۸۱) سال کی عمر میں ۱۴/اگست ۱۹۷۹ء کو لندن میں انتقال ہوا اور ان کے جنازے کو کراچی لا کر قبرستان سخی حسن میں دفن کیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبالؒ کی ازدواجی زندگی ہر گونہ مسائل سے دوچار تھی۔ علامہ اپنی پہلی شادی سے خوش نہیں تھے اور کریم بی کو طلاق دینا چاہتے تھے۔ لیکن کریم بی نے طلاق کے بدلے جدا زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی اور علامہ اپنی آخری عمر تک اُن کے اخراجات برداشت کرتے رہے۔ اس شادی کے بارے میں ۹/اپریل ۱۹۰۹ء کو عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں ''میری تنہا آرزو یہ ہے کہ اس شہر سے کہیں باہر نکل جاؤں لیکن تم جانتی ہو کہ میں اپنے بھائی کا احسان مند ہوں جو میرے اس شہر سے باہر جانے کے مخالف ہیں۔ میری زندگی سخت مصیبت زدہ ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں کسی طرح سے کریم بی کے ساتھ زندگی بسر کروں جو ممکن نہیں، میں پہلے ہی سے اس شادی سے خوش نہ تھا۔ میں حاضر ہوں کہ اخراجات کفالت برداشت کروں لیکن اُس کے ساتھ زندگی بسر نہ کروں''۔

عطیہ فیضی نے اس شادی کی شکست کی وجہ دونوں کی فکری صلاحیتوں میں شدید فرق اور طبیعتوں میں اختلاف بتایا ہے۔ اس شادی کے اختلافات اور دوری کی وجہ سے آفتاب اقبال، علامہ کی محبت اور شفقت سے محروم ہوئے اور چونکہ وہ اپنی ماں کے ہم خیال تھے اور اس شادی کی شکست کے پورے ذمہ دار علامہ کو سمجھتے تھے اس لئے روز بروز اُن کے اور علامہ کے درمیان تعلقات خراب ہوتے گئے۔ نذیر نیازی "دانای راز" میں اس شادی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''اس شادی کی شکست کی وجہ کریم بی کے اخلاق اور ان کی خشک طبیعت تھی اس کے علاوہ خود آفتاب کی رفتار و گفتار انھیں علامہ سے دور کھینچتی جاتی تھی"۔ جاوید اقبال نے اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں لکھا کہ ''میں ان مطالب کو بیان کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ علامہ نے جو رویش اختیار کی تھی اگرچہ وہ عمدی نہ تھی لیکن رویش معقول نہ تھی۔ آفتاب ضدّی تھے اور ہمیشہ علامہ کے خلاف کھڑے ہوتے اور علامہ کے خلاف جو اتہامات لگائے جاتے وہ اُن سے فائدہ اُٹھاتے تھے''۔

ہوں اور میرے لبوں پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا۔ شاید آپ پہلے آدمی ہیں جسے میں نے یہ باتیں لکھی ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ نے اس کی مدد کی ہے کچھ اس لئے کہ اس نے آپ کو خوب متاثر کیا ہے اور کچھ میرے تعلق سے آپ کی فیاض فطرت اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی مگر مجھے یقین ہے آپ کا اس پر اور مجھ پر بڑا کرم ہوتا اگر اس کو کوئی موضوع ملازمت جامعہ عثمانیہ میں دلا سکتے'' اس خط کا جواب ۱۱ر مئی ۱۹۳۱ء کو سر اکبر حیدری نے دیا اور علامہ کی مجبوری کو تسلیم کیا اور انھیں یقین دلایا کہ وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کو کوئی موزوں جگہ دلوانے کی اپنی کوشیش جاری رکھیں گے۔ علامہ نے ۱۴ر مئی کو اس خط کے جواب میں لکھا۔ ''یہ نوجوان اب تک (۷۰) ہزار روپے اپنے اوپر خرچ کر چکا ہے۔ اس میں سے خود اپنے بقول اس نے (۵۰) ہزار روپے انگلستان میں قرض لئے ہیں۔ میں نے اس کی ماں کو دس ہزار روپے دئے تھے جو اس نے سب کے سب اس پر خرچ کر دئے اور یہ رقم بھی اس کے علاوہ ہے جو اس نے اور اس کے باپ نے اس لڑکے کو دیے۔ اس کی انگلستان سے واپسی کے صرف ایک دو ماہ قبل مجھے ایک ہزار روپے دینے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے باوجود وہ اکثر و بیشتر بلیک میلنگ پر مبنی خطوط بھیجتا رہتا ہے۔ میں اس کے تازہ ترین خط کی نقل آپ کو ارسال کرنا چاہتا تھا مگر میں ایسا نہیں کرتا بالخصوص اس واسطے کے میں نے سوچا اس کے بعد آپ اس کے ساتھ ہمدردی کرنا ترک فرمادیں گے فارسی کا یہ شعر میری موجودہ کیفیت ذہنی کے مطابق ہے۔

آں جگر گوشہ ہماں شد کہ من اول گفتم کہ چو شوید لبش از شیر جگر خوارہ شود

(یعنی یہ جگر کا ٹکڑا وہی ہوا جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ جب دودھ منہ سے پونچھے گا تو جگر خوار بن جائے گا)

اگر چہ کچھ اطلاعات کے مطابق اکبر حیدری اور علامہ کے درمیان اس مسئلہ پر گفتگو جاری رہی چناں چہ اکبر حیدری ۱۲ر فبروری ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''اگر مجھے پہلے ہی سے ان ناخشگوار حالات کا علم ہوتا جس کی آپ نے نشاندہی کی ہے تو بلاشبہ میں اس اپیل کو نظر انداز کر دیتا''۔

آفتاب اقبال علامہ کے انتقال کے (۴۰) سال بعد تک زندہ رہے لیکن وہ اب ہمیشہ اقبال کے

مداح خوان تھے اور ہمیشہ اپنے والد کے محاسن پر گفتگو کرتے تھے۔ جن افراد نے کراچی کے یوم اقبال کے جلسات میں شرکت کی ہے وہ جانتے ہیں کہ آفتاب اقبال ہر سال ان جلسات میں دلنشین اور فلسفانہ تقریر کرتے اور علامہ کے کلام پر تبصرے کرتے تھے۔

اقبالؔ کیسے علامہ سے سر ہو گئے

حکومت انگلستان نے یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو علامہ اقبالؔ کی علمی اور فرہنگی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُنھیں ''سر'' کا خطاب دیا۔ چنانچہ ۱۷ جنوری ۱۹۲۳ء کو شام کے چار بجے مقبرہ جہانگیر شاہ باغ لاہور میں یہ پُرشکوہ محفل ضیافت برگزار ہوئی ۔ اس محفل کی صدارت پنجاب کے گورنر Sir E.Mclagen نے کی۔ اس محفل میں ملیٹری کمانڈروں کے علاوہ سر جان منیارڈ، میاں فضل حسین وزیر تعلیم و آموزش، لالہ ہرکشن لال وزیر انڈسٹریز، نواب میر فتح علی خان، میاں احمد یار خان، سر ذوالفقار علی خان، راجہ نریندر ناتھ اور چودھری شہاب الدین شامل تھے۔ یونیورسٹی اور مدارس کے مختلف اساتذہ اور طالب علموں کے ساتھ ساتھ خاصی تعداد میں ہندوستانی اور یورپائی خواتین بھی اس بزم میں شریک تھیں۔ اس محفل میں شرکت دعوت نامہ پر منحصر تھی۔ ضیافت شام کے بعد طالب علموں نے علامہ اقبالؔ کی نظم "ترانہ ہندی" پڑھی۔ سر ذوالفقار علی خان نے اپنی تقریر میں علامہ اقبالؔ کی علمی وادبی سماجی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ برصغیر میں رابندر ناتھ ٹیگورؔ کے نوبل پرائز کے بعد دوسری شخصیت جس کی خدمات کا صحیح اعتراف کیا گیا ہے وہ علامہ اقبالؔ ہیں۔ علامہ نے انگریزی زبان میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مغربی حکومتیں اس دور میں علوم مشرقیہ پر توجہ کر رہی ہیں چنانچہ مجھے یہ خطاب دے کر حکومت انگلستان نے اُردو اور فارسی کے ادیبوں کی قدردانی اور ان کا احترام کیا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے ۲۴ جنوری ۱۹۲۳ء کو مہاراجہ کشن پرشادؔ کو خط میں لکھا تھا کہ سر کا خطاب مجھے اسرار خودی کے اشعار سے متاثر ہو کر دیا گیا ہے ان اشعار کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے اور یورپ اور امریکہ میں ان اشعار پر تبصرے کئے گئے ہیں۔ اگرچہ پنجاب کے چیف جسٹس سر شادی لال نے کچھ مہینوں قبل علامہ اقبالؔ سے کہا تھا کہ میں آپ کو سر کے خطاب کے لائق سمجھا ہوں اور اس کے لیے حکومت انگلستان سے پیشنھاد کرنا چاہتا یوں تو علامہ اقبالؔ نے فوری جواب دیا تھا کہ مجھے اس خطاب کی آرزو نہیں ہے اور خاص طور پر اس ضمن میں آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتا۔ تاریخی دستاویز سے یہ بات ظاہر ہے کہ جسٹس شادی لال کو علامہ اقبالؔ سے خصومت تھی اور وہ علامہ کی بڑھتی ہوئی شہرت سے

حاسد تھے چنانچہ جب شادی لال کو معلوم ہوا کہ حکومت انگلستان نے علامہ اقبالؔ کو سر کے خطاب کے لیے انتخاب کرلیا ہے تو وہ اپنی چابک فکری اور منافقانہ رویّہ سے اس کام کا سہرا اپنے سر لینا چاہتے تھے جس کو علامہ نے فوری رد کر دیا لیکن بعد میں گورنر پنجاب Sir McLagen کے اصرار پر اس خطاب کو اس لیے قبول کیا کہ یہ خطاب صرف علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جا رہا تھا۔ علامہ اقبالؔ نے اس خطاب کو قبول کرنے سے قبل یہ شرط بھی رکھی کہ پہلے ان کے استاد محسن مولوی میر حسنؔ کی خدمات کی قدر دانی شمس العلماء کے خطاب دے کے کی جائے۔ گورنر پنجاب کے سوال پر کہ مولوی میر حسنؔ کی کتنی تصانیف ہیں علامہ نے کہا کہ مولوی میر حسنؔ نے اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن میں مولوی میر حسن کی زندہ تصنیف و تالیف ہوں۔ علامہ اقبالؔ نے مزید کہا کہ اس خطاب کو عطا کرتے وقت انھیں لاہور آنے کی زحمت نہ دیں کیونکہ وہ ضعیف ہیں اور اس سفر میں زحمت ہو سکتی ہیں چنانچہ شمس العلماء کا خطاب مولوی میر حسنؔ کے فرزند کے سپرد کیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ کو یہ خطاب اُس وقت دیا گیا جب کہ خاص و عام ان خطبات کو مشکوک نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ علامہ کے بعض دوست بھی اِسے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے ۔ چنانچہ لوگ اپنی فکر و ہمّت کے پیمانوں پر علامہ کو تولنے لگے کہ اب اقبالؔ وہ اقبالؔ نہیں رہینگے ۔ عبدالمجید سالکؔ مصنّف ذکر اقبالؔ لکھتے ہیں اس خطاب پر احتجاج کرتے ہوئے مولانا ظفرؔ علی خان نے کچھ معترضانہ اشعار لکھے اور اُسے مجلّہ زمیندار میں شائع کئے جو زبان زدہ عام ہو گئے۔

لو مدرسۂ علم ہوا قصر حکومت — افسوس کہ علامہ سے سر ہو گیے اقبالؔ
پہلے تو سر ملّت بیضا کے تھے وہ تاج — اب اور سُنو تاج کے سر ہو گئے اقبالؔ
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ — سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبالؔ

اقبالؔ کے دوست جناب عبدالقادر گرامیؔ جنھوں نے اقبالؔ کے فارسی اشعار پر اصلاح دی وہ بھی پہلے ناراض ہو گئے اور کہا۔

کرد اقبالؔ را حکومت سرد — عقل علامہ سوفت سوختہ بہ

لیکن چند سال بعد مطمین ہو کر یہ اشعار لکھے اور اقبالؔ کو سراہا۔

ہر نکتہ علامہ وفا آہنگ است ہر حرف کلید وحکمت فرہنگ است
اقبالؔ کہ اقبالؔ شد از جوہر علم حاسد او او کند علاجش سنگ است

علامہ اپنے قدیم دوست میر غلام نیرنگ کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں کہ ''قسم اللہ کی جس کے ہاتھ میری جان اور آبرو ہے اور قسم اُس کے رسولؐ پاک کی جس کے ارشادات سے میں خدا پر ایمان لایا اور مسلمان ہوا، دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر اقبالؔ کی ظاہری زندگی مومنانہ نہیں مگر اس کا قلب تو ہمیشہ کی طرح مومن رہے گا''۔ اقبالیات کے محققین نے بھی یہ بات دلائل سے ثابت کر دی ہے کی علامہ کے خطاب کو قبول کرنے کی مصلحت دفاعی عمل تھا کیوں کہ اُس زمانے میں مسلمان عجیب افسردگی اور عقب ماندگی کا شکار ہو چکے تھے اور دوسری قومیں انگریز دوستی اور تعلیم تحصیل میں ترقی کر کے بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ حقیقت میں علامہ اقبالؔ ان مسائل سے بہت دور رہتے تھے۔ چنانچہ جب مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۰ء میں علامہ اقبالؔ کو خط میں لکھا کہ آپ دانشگاہ ملّی کی سرپرستی کو قبول کر کے اُسے اپنی صحیح رہنمائی سے ترقی دیں تو اقبالؔ نے جواب میں لکھا کہ اگرچہ میں مسلمان قوم کی تعلیم کی شدت سے حمایت کرتا ہوں لیکن میں ان رقابتوں اور فضول کشمکشوں میں کام انجام نہیں دے سکتا۔

اس موقع پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض افراد غلط فہمی کا شکار ہو کر Noble Prize کے بارے میں ٹیگور اور اقبالؔ کو ایک دوسرے کا حریف قرار دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اقبالؔ کو مسترد کر کے ٹیگور کو نوبل پرائز کا مستحق قرار دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کا نام کبھی رسمی طور پر نوبل کمیٹی کے سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ ٹیگور اقبالؔ سے (۱۸) سال بڑے تھے اور ۱۴ نومبر ۱۹۱۳ء کو ٹیگور کو نوبل انعام مبلغ ایک لاکھ دس ہزار سکّہ ہند عطا کیا گیا جو ٹیگور کی کتاب ''گیتانجلی'' کے انگریزی ترجمے اور اُن کے سماجی خدمات کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کے مقام میں نوبل انعام نہ ملنے سے کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اگر ٹیگور کے پاس ذات اور انسانیت کے بارے میں گفتگو ہونے کی وجہ

سے انھیں نوبل پرائیز کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے تو علامہ اقبالؔ کا کلام جو کائنات اور رہنمائی انسانیت کے بیانات سے لبریز ہے اس سے بھی اعلیٰ انعام کا حقدار ہوسکتا ہے۔ شمالی امریکہ کے مشہور شاعر، محقق اور نقاد جناب ڈاکٹر عروجؔ زیدی کے تین شعر جو موصوف کی نظم اقبالؔ سے ہیں ہم یہاں پر پیش کر کے اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہیں۔

گیتانجلی کی بزم کہاں اور تو کہاں — برگ حنا کا رنگ کہاں اور لہو کہاں
میخانۂ رموز میں یہ ہائے ہو کہاں — انعام خسروی کی یہاں آبرو کہاں
ٹیگور کے پیام کی جو کائنات ہے — وہ تیرے فکر و فن میں فقط اک بات ہے

معلّم اقبالؔ شمس العلما میر حسن

علاّمہ اقبالؔ کی ساٹھویں برسی کی نسبت سے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اُن کے شفیق اُستاد شمس العلما میر حسنؔ کا تذکرہ کروں تا کہ اُستاد اور شاگرد کی روحیں بھی شاد ہوں اور ہمارے درمیان اُن کی یادیں بھی آباد رہیں۔ شمس العلما سید میر حسن کی پہلی ملاقات علاّمہ اقبالؔ سے اُس وقت ہوئی جب علاّمہ کی عمر صرف چار سال چار مہینے تھی۔ اقبالؔ کو اُنکے والد شیخ نور محمد نے صرف مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے غلام حسن کے مکتب میں روانہ کیا تھا جو سیالکوٹ کے محلّہ شوالہ کی مسجد میں واقع تھا۔ ایک دن مولوی میر حسن مکتب آئے اور جب اُن کی نگاہ اُس کمسن بچے پر پڑی جس کی پیشانی کشادہ، جس کے بھورے رنگ کے بال اور جس کا چہرہ معصومیت سے لبریز تھا تو آپ نے پوچھا کہ یہ کس کا بچہ ہے؟ اور پھر اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد کے پاس جا کر اُنھیں سمجھایا اور راضی کیا کہ بچوں کے لیے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدید کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ چنانچہ خود مولوی میر حسن نے اقبالؔ کو سکاچ میشن کے مدرسہ میں داخل کیا جہاں سے آپ نے میٹرک پاس کیا۔

مولوی سید میر حسن ۱۸۴۴ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں انتقال فرمایا۔ آپ نے تقریباً ۸۵ سال عمر پائی۔ علاّمہ اقبالؔ نے ۴۸ سال تک اس شفیق اُستاد سے فیض اُٹھایا اور اُن کی آخری عمر تک احترام کیا اور خدمت گذاری انجام دی۔

کتاب ''روزگار فقیر'' تالیف سید وحیدالدین، ''علاّمہ سر اقبالؔ'' تالیف شیخ آفتاب احمد کے علاوہ ''ذکر اقبالؔ'' اور ''نیرنگ خیال'' میں لکھا ہے کہ مولوی میر حسن ایک راسخ الاعتقاد مسلمان اور باعمل مومن تھے۔ وہ حافظ قرآن بھی تھے۔ مولوی صاحب علوم اسلامی، عرفان اور تصوف میں ید طولیٰ رکھتے ہوئے علوم جدید ادبیات، زبان اور ریاضیات میں ماہر تھے۔ ہزاروں اشعار عربی، فارسی، اُردو اور پنجابی میں زبانی یاد تھے۔ نماز صبح کے بعد ہر روز پہلے قبرستان جا کر عزیزوں اور دوستوں کے لیے فاتحہ پڑھتے، گھر پہنچ کر ناشتہ کرتے اور پھر تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا۔ شاگردوں کو گھر پر تعلیم دیتے، پھر مدرسے میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے۔ شام کو جب بازار جاتے تو شاگرد ساتھ ساتھ رہتے اِس طرح

اُستاد اور شاگردوں کا یہ قافلہ راہ کسب علم میں ہر صبح سے دیر گئے رات تک گامزن رہتا۔ مولوی میر حسن متین، قناعت پسند، متواضع، خوش اخلاق اور پاک صفت انسان تھے۔ آپ کی زندگی سادہ اور لباس معمولی اور پاکیزہ ہوتا تھا۔ آپ کی تنخواہ جو مدرسہ سکاچ میشن سے ملتی تھی کبھی (۱۲۰) روپیوں سے زیادہ نہیں رہی۔ علامہ اقبالؔ نے بہت سی اخلاقی خصوصیات اور قلبی وارادات کو اپنے استاد ہی سے حاصل کیا تھا۔ علامہ میر حسن کی بہت عزت کرتے تھے اور انھیں ہمیشہ ''شاہ صاحب'' کہہ کر یاد فرماتے۔ احترام کا یہ حال تھا کہ پہلے پہل استاد کے سامنے کبھی شعر پڑھنے کی جرات نہیں کی لیکن بعد میں جب مولوی صاحب نے شعری ترغیب کی اور فن شعر کی تعلیم دی تو اُن سے بھرپور استفادہ کیا اور میر حسن صاحب ہی کے مشورے سے حضرت داغؔ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال ''زندہ رود'' میں رقم کرتے ہیں کہ ایک دفعہ مولوی صاحب کے ساتھ اقبالؔ بازار گئے مولوی صاحب کے کسی عزیز کا چھوٹا بچہ جسکا نام احسان تھا ساتھ ہو گیا۔ احسان بہت موٹا تھا مولوی صاحب نے اقبالؔ سے کہا کہ بچے کو گود میں اُٹھالو، کچھ راستہ چل کر اقبالؔ نے اُسے دکان پر اُتارا اور تھکن دور کرنے لگے۔ مولوی صاحب متوجہ ہوئے اور کہا اقبالؔ اس چھوٹے بچے کو بھی اُٹھانا تمہارے لیے مشکل ہے؟ اقبالؔ نے فوراً جواب دیا ''شاہ صاحب آپ کا احسان بہت سنگین ہے''۔

علامہ اقبالؔ کے دل میں اپنے استاد کی قدر و منزلت اور محبت کس قدر تھی اُن اشعار سے چھلکتی ہے جو موصوف نے ۱۹۰۵ء میں انگلستان روانہ ہوتے وقت خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر نظم التجائے مسافر میں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

وہ شمع بارگہ خاندانِ مرتضویؑ — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجکو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں — کرے پھر اُس کی زیارت سے شادماں مجکو

شمس العلما میر حسن، سر سید احمد خان کے حامیوں میں سے تھے۔ چنانچہ جب سر سید اپنے نواسے سر راس مسعود کے ہمراہ پنجاب آئے تو میر حسن صاحب نے اقبالؔ کا تعارف سید احمد خان اور سر راس

مسعود سے کروایا چنانچہ اسی ملاقات کے بعد آخری عمر تک اقبالؔ اور راس مسعود صمیمی دوست اور ہمفکر رفیق بنے رہے۔

۱۸۹۸ء میں جب سرسید کے انتقال کی خبر سیالکوٹ پہنچی تو علامہ اقبالؔ تعطیلات گزارنے کے لئے سیالکوٹ لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ مولوی میر حسن نے مادّہ تاریخ نکالنے کے لیے کہا تو اقبالؔ نے چند ہی گھنٹوں میں "انی متوفیك و رافعك الی و مطهرك" مادہ تاریخ استخراج کیا۔ اور خود میر حسن نے "غفرله" تاریخ نکالی۔ مولوی میر حسنؔ کے بڑے بیٹے سید محمد تقی شاہ اور اُن کے چھوٹے بیٹے سید محمد ذکی شاہ سے علامہ کا یارانہ تھا اور دن رات اِن کے ساتھ بچپنے اور جوانی میں اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ مولوی میر حسن کے نواسے جناب سجاد حیدر آج بھی لاہور میں بقید حیات ہیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ جب ۱۹۲۳ء میں حکومت برطانیہ نے علامہ اقبالؔ کو سر کا خطاب عطا کرنے سے آگاہ کیا تو علامہ نے پنجاب کے گورنر جنرل سے کہا کہ جب تک اُن کے استاد میر حسنؔ کی قدر دانی نہیں کی جائے گی وہ کسی قسم کا اعزاز قبول نہیں کریں گے۔ گورنر نے پوچھا کہ مولوی صاحب کی کوئی تصنیف بھی ہے؟ علامہ نے جواب دیا ''میں خود اُن کی تصنیف ہوں''۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے مولوی میر حسنؔ کو شمس العلما کا خطاب دے کر علامہ کو ''سر'' کا خطاب دیا۔ علامہ اقبالؔ چار سال سے ۵۲ سال کی عمر تک اپنے استاد میر حسن سے وابستہ رہے۔ ہمیشہ اُن سے ملتے جلتے رہتے اور اپنے ہر کام میں اُن سے مشورہ کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا بھی یہی حال تھا کہ اپنے شاگرد کی شہرت اور کامیابی دیکھ کر جذباتی ہو جاتے کہ جب کبھی اقبالؔ کا نام بھی آجاتا تو خوشی کے آنسو نکل جاتے۔ کیا دنیا میں کسی اور اُستاد اور شاگرد کا ایسا محبتی رشتہ ہو سکتا ہے۔ صحیح کہا ہے

دل بہ دل راہ دارد

جب ۱۹۳۹ء میں (۸۵) سال کی عمر میں شمس العلما میر حسن نے داعی اجل کو لبیک کہا تو علامہ اقبالؔ نے مادہ تاریخ استخراج کی۔ "ما ارسلنك الا رحمته للعالمین" یہ سچ ہے کہ یہ رحمت للعالمینؐ ہی کی رحمت تھی جس نے مولوی میر حسن جیسے شفیق استاد کو علامہ کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔

علامہ اقبالؔ مشاہیر عالم کی نگاہ میں

علامہ اقبالؔ برصغیر کی وہ اہم شخصیت تھے جنھیں اپنی زندگی میں شہرت دوام حاصل ہو چکی تھی۔ اس خصوصی مضمون میں ہم بعض مشاہیر کے اقوال اور بعض عظیم شعرا کے اشعار پیش کریں گے جو اگرچہ مشتی از خروار محسوب ہوتے ہوئے بھی علامہ کی شخصیت کے پرتو کو واضح کرنے کے لئے سوانح عمری کے راستے پر سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، کیوں کہ یہ افراد مختلف ملک، قوم، زبان، تمدن اور مکاتیب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

قایدِ اعظم محمد علی جناح نے فرمایا'' شعرِ املّت کے بدن میں تازہ روح پھونکتے ہیں۔ ملٹن، شیکسپیر اور بائرن وغیرہ نے اپنی ملّت کی بڑی خدمتیں کیں ہیں۔ کارلائل اپنی تصنیف میں شیکسپیر کی بزرگی کا اقرار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب اُسے اختیار ہے کہ شیکسپیر یا حکومت برطانیہ کو انتخاب کرے تو وہ کسی بھی قیمت پر شیکسپیر سے دست بردار نہ ہوگا۔ اگرچہ میں سلطنت نہیں رکھتا لیکن اگر سلطنت حاصل ہو جائے اور مجھ سے کہیں کہ سلطنت یا اقبالؔ کو انتخاب کروں میں حتماً اقبالؔ کو انتخاب کروں گا۔

دورِ حاضر میں دینِ اسلام کو کسی نے بھی اقبالؔ سے خوب تر اور بہتر درک نہیں کیا۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ مجھے یہ موقع ملا کہ میں اقبالؔ کی رہبری میں ایک سپاہی کی طرح کام کرسکوں۔ میں نے اس دور میں اقبالؔ سے بڑھ کر کسی اور کو اسلام کا رفیق باوفا اور شیدا نہیں دیکھا''۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا۔'' اقبالؔ کی ذہانت اور ہندوستان کی آزادی سے محبت نے مجھے بہت متاثر کیا ان کی عظیم نظمیں آنے والی نسلوں کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رکھیں گی اور انھیں فیض پہونچاتی رہیں گی''۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔'' ڈاکٹر اقبالؔ کی موت سے جو عمیق زخم دنیائے ادب کے جسم پر لگا ہے اُس کے پُر ہونے کے لئے لمبی مدّت درکار ہے۔ آج کل ہندوستان کا رتبہ دنیائے ادب میں اتنا کم پایہ ہے کہ ہم کسی صورت ایسے عظیم الشان شاعر کی شاعری سے دستبردار نہیں ہو سکتے جس کی شاعری کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے''۔

پروفیسر آرنلڈ برطانوی کہتے ہیں ''اگرچہ اقبالؔ میرے شاگرد ہیں لیکن میں ان کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔ ہندوستان نے اپنی حرکت تجدید اقبالؔ کے اشعار سے حاصل کی۔ اقبالؔ دوسرے لوگوں کے خیالات کی بازگشت نہیں بلکہ ایک اور یجنل مجتہد اور مفکر ہیں''۔

ڈاکٹر نکلسن لکھتے ہیں ''اقبالؔ کے اشعار نے مسلم جوان کو بیدار اور باخبر کر دیا ہے چنانچہ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس مسیحا کے وہ منتظر تھے وہ مسیحا آچکا ہے''۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے کہا۔ ''اقبالؔ ایک ایسے عظیم شاعر ہیں جنھوں نے اپنی عظمت جہان اسلام پر ثابت کر دی ہے''۔

سر تیج سپرو لکھتے ہیں۔ ''اقبالؔ کے ساتھ وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ بات کہتے ہیں کہ وہ محض ایک اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اُس کے دائرہ اثر کو محدود کرنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر ہے، کالیداس ہندو مذہب کا شاعر ہے ان کے اثر کو محدود نہ کیا اور نہ اور مذہب کے لوگوں نے اس وجہ سے ان کی قدر دانی میں کمی کی''۔

علامہ سعید نفیسی تہرانی نے کہا۔ ''اقبالؔ آسمان پاک پر چمکنے کے ساتھ ساتھ اپنی روشنی ایران پر ڈال رہا ہے اور یہ امر بالکل قدرتی ہے کیونکہ ایران، پاکستان نزدیک اور دیوار بہ دیوار سہارے ہیں اور آفتاب ہر دو گھروں کو ایک وقت میں روشنی دیتا ہے۔ اس جہان میں روشنی اور نور پھیلانے والا خورشید پاکستان کا عظیم شاعر محمد اقبالؔ ہے جو نو سو سال کے ہند و ایران کی فارسی روایات کا وارث ہے''۔

مولانا محمد جوہر کہتے ہیں۔ ''اقبالؔ بیسوی صدی کے ہندوستان میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا شاعر ہے۔ اسلامی ہندوستان سب سے زیادہ پنجاب کے اس شرمیلے حیادار اور خلوت پسند بیرسٹر کا احسان مند ہے تمام اُردو بولنے والے اس کے نام سے آشنا ہیں اور میں اس کا چاہنے والا اور پرستار ہوں''۔

مہاراجہ کشن پرشاد کہتے ہیں۔ ''اقبالؔ جس بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے وہ اس کا جائز حق ہے اس کا پیغام فرزندان مشرق کبھی فراموش نہ کر سکیں گے''۔

ہربرٹ ریڈ انگلیسی لکھتا ہے۔ ''اگر شعرا عصر کو میزان صداقت ماورای طبیعات پر پرکھیں تو ہمیں صرف ایک شاعر نظر آتا ہے جو ہماری نسل اور قوم سے نہیں۔ میری مراد محمد اقبال ہیں جن کی نظم اسرار خودی کا ترجمہ ڈاکٹر نکلسن نے کیا ہے''۔

علامہ شبلی نے ۱۹۱۱ میں اقبال کو برصغیر کا ملک الشعرا کہا تھا۔

ڈاکٹر منوچہر اقبال وزیر ایران کہتے ہیں ''عام طور پر اقبال کو پاکستان کے ایک فلسفی شاعر اور ہنرمند سخن سرا کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کے حالات اور اس کے کلام کی طرف صحیح طور پر توجہ دی جائے تو معلوم ہوگا کہ اقبال محض ایک مخصوص قوم یا ملک کا شاعر نہیں بلکہ عالمی شخصیت کا مالک اور عالم انسان کا رہنما ہے''۔

سید سلیمان ندوی کہتے ہیں ''شاید کم لوگ آگاہ ہیں کہ اقبال نے ایک صوفی خاندان میں آنکھیں کھولیں ان کے والد ایک خوش مشرب صوفی تھے ان کے دوست احباب بھی صوفی منش تھے چنانچہ اقبال نے اس صوفیانہ ماحول میں پرورش و تربیت پائی۔ اقبال صرف شاعر نہ تھے بلکہ وہ حکیم تھے جو اسرار کلام الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا تھے۔ وہ بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتے تھے''۔

ابوالکلام آزاد نے کہا ''جدید ہندوستان ان سے بڑا شاعر پیدا نہیں کر سکا۔ ان کی فارسی شاعری بھی جدید فارسی ادب میں اپنا مقام رکھتی ہے''۔

مولانا خواجہ حسن نظامی کہتے ہیں۔ ''اقبال نے جمعرات کے دن ۱۹ صفر ۱۳۵۷ھ صبح صادق کے وقت اس دنیا سے کوچ فرمایا وہ چونکہ محب اہلبیتؑ تھے اس لئے قدرت نے ان کو چہلم سید الشہدا سے ایک دن پہلے کی تاریخ عطا فرمائی''۔

ڈاکٹر عبدالوہاب مصری لکھتے ہیں ''اگر جلال الدین رومی دوبارہ زندہ کئے جائیں تو اُن کی صورت و شخصیت حتماً علامہ اقبال ہوگی۔ ساتویں صدی کے جلال رومی اور چودھویں صدی کے محمد اقبال ایک ہی تصور کئے جائیں''۔

فیض احمد فیض کہتے ہیں ''اقبال ایسا ہے کہ اُسے پڑھتے وقت کوئی اور چیز نظر میں نہیں جچتی، یہ محسوس ہوتا

ہے کہ بس شاعر ہی وہ ہیں۔ فکر اور شعر دونوں میں ہمہ گیری اور آفاقی ہے''۔

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ''علامہ کی شخصیت عالمگیر تھی وہ سب سے بڑا مسلمان اور سب سے بڑا برصغیر کا باشندہ تھا جو چشم خود بست و چشم ما کشاد''۔

قاضی نذر الاسلام بنگلہ دیشی۔ ''اقبال کی عظمت ایسی ہے کہ آج کل اُردو زبان افراد کی زبان پر صرف اقبال کا ذکر جاری ہے''۔

ایران کے عظیم شاعر اور ملک شعرا بہار خراسانی نے چند معرکتہ آرا اشعار اقبال کے لئے لکھے۔

بیدلی گر رفت اقبالی رسید　　بیدلان را نوبت عالی رسید

این سلامی میفرستم سوئی یار　　بی ریا تر از نسیم نو بہار

قرن حاضر خاصہ اقبال گشت　　واحدی کزصد ہزاراں بر گذشت

شاعراں گشتند جوں تار مار　　ویں مبارز کرد کار صد ہزار

یعنی جب بیدلی (بیدل) گذر گئی تو اقبالی (اقبال) پہنچے جس سے بیدلوں میں جان پڑ گئی۔

یہ پیغام سلامتی دوست کی طرف روانہ کر رہا ہوں جو نسیم بہار کی طرف بے ریا ہے۔

موجودہ زمانہ خاص طور پر اقبال کا زمانہ ہے۔ اقبال تنہا لاکھوں سے بازی لے گیا۔

شعرا ایک پامال شدہ فوج کے مانند تھے مگر اس جنگجو نے سینکڑوں سواروں کا کام کیا۔

مولانا غلام قادر گرامی کہتے ہیں۔

در دیدۂ معنی نگھان حضرت اقبال　　پیغمبری کرد و پیغمبر نتوان گفت

حضرت اکبر الہ آبادی خواجہ حسن نظامی اور علامہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

حضرت اقبال اور خواجہ حسن　　پہلوانی ان میں ان میں بانکپن

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد　　قومی رکنوں کے ہیں نگہبان وہ بھی

تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر　　ہیں دشمن فتنہ رقیباں وہ بھی

پریوں کے لئے جنوں ہے تم کو اگر　　دیووں کے لئے ہے سلیماں وہ بھی

مولانا حامدؔ حسن قادری نے میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ کا موازنہ خوب کیا ہے۔

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے — جن کی فیض طبع نے اُردو کو گنج زر دیا
اک اثر میں بڑھ گیا اک رفعت تخئیل میں — تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا

فیض احمد فیضؔ کے دو قطعات اقبالؔ پر۔

سنی واماندۂ منزل نے آواز درا آخر — ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحر خاموشی
مئے غفلت کے ماتے خواب دیرینہ سے جاگ اٹھے — خود آگاہی سے بدلی قلب و جہاں کی خود فراموشی
نبود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے — ہر اک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے
ہر ایک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے — ہر اک ذرے کو ہم دوش ثریا کر دیا تو نے

محسنؔ احسان نے ایک نظم ''نوارا تلخ ترمی زن'' اقبالؔ کے نام لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

تو عشق کا درس دینے آیا — ہم لوگ ہوس پرست نکلے
پرویزی و خواجگی سجائے — ہم اپنے نشے میں مست نکلے
شاہین ترا شاہ پارۂ ذہن — ہم مور و مگس سے پست نکلے
چندھیا گئیں روشنی سے آنکھیں — جب غیر سحر بدست نکلے
پیغمبر مشرق جو شکایت — تھی تجھ کو مجھے بھی آج تک ہے

احمد ندیم قاسمیؔ بخدمت اقبالؔ لکھتے ہیں

جس قدر امت مسلم پہ کرم ہیں تیرے — اتنے ہی ملت آدم پہ ہیں تیرے احسان
عہد فردا میں جو تاریخ لکھی جائے گی — ترے شعروں سے چنے جائیں گے اُس کے عنوان
مجھ کو دعویٰ ہے کہ اس دور کا شاعر ہوں مگر — شعر کہتا ہوں تو یاد آتا ہے تیرا فرمان

علی صادق سرمدؔ نے کہا

گرچہ مرد بہ میرد بہ گردش مہ وسال — نمردہ است و نمی میرد محمد اقبالؔ

نواب بہادر یار جنگ کہتے ہیں ''کسی کا مہدی کوئی اور ہو تو ہو میرا مہدی اقبالؔ ہے''۔

ای ایم فاسٹر لکھتا ہے۔ ''اقبالؔ کٹر مسلمان تو تھا مگر وہ روایات کا پرستار نہ تھا۔ اس کے خیالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہو مگر وہ انتہا پسند نہ تھا۔ اُس نے ہمیشہ ہندوؤں اور عیسائیوں کا ادب واحترام کیا ہے''۔

سابق صدر بھارت ڈاکٹر رادھا کریشنن کہتے ہیں۔ ''اقبالؔ نے اسلام کی اصلی روح کو پیش کر کے مارکسی مادیّت اور موجودیت کے حملوں کے بالمقابل مذاہب کی مدافعت اور حمایت کی ہے''۔

ایران کے رہبر اور سابق پریسڈنٹ آیت اللہ خامنہ ای کہتے ہیں ''علامہ اقبالؔ کی اسلام دوستی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھوں نے Edward Brown کی Literary History of Persia اور Arnold کی An Invitation to Islam اس لئے ترجمہ نہیں کی کہ اُن کتابوں کی تہہ میں چھپی برطانیہ پالیسی جس میں جہاد کو غیر ضروری مسئلہ قرار دیا گیا تھا۔ قرآنی تعلیمات اور احادیث نبویؐ کو اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں پھیلانے کے لئے اقبالؔ کے کلام سے آشنائی اور اس کی اشاعت ضروری ہے کیوں کہ اسلام کی طرح اقبالؔ کا کلام بھی تمام انسانیت عالم کے لئے ہے۔ علامہ اقبالؔ کی اس سے بڑی عظمت کی مثال کیا ہوگی کہ وہ شخص جس نے کسی دنیاوی قدرت کے سامنے کبھی سر خم نہیں کیا وہ مسلمانوں کے آگے اتحاد اسلامی کے لئے دست دراز اور جھکا ہوا نظر آتا ہے''۔

اس مضمون کے اختتام پر ہم میکشؔ، وجدؔ اور مخدومؔ محی الدین کے اشعار جو اقبالؔ کے اعتراف میں لکھے گئے پیش کرتے ہیں۔

میکشؔ۔ سونے والوں کو پیام صبح جو دیتی ہوئی — خواب کی دنیا اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی
مطلع مشرق پہ چمکا آفتاب شاعری — ہر کرن جس کی بنی تار رباب شاعری
قلب شاعر سے صداقت لے کے نکلی شاعری — سچ کہا ہے شاعریٔ جزویست از پیغمبری

وجدؔ۔ ترا ہر شعر دل کی سمت پورا وار ہے گویا — زبان پاک تیری تیغ جوہر دار ہے گویا
جہاں میں نام پیدا کر لیا ہے ہم نشینوں نے — کئی خرمن بنا ڈالے ہیں تیرے خوشہ چینوں نے

مخدومؔ۔ اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا — جانب مشرق اجالا سا نظر آنے لگا
عرش کی قندیل ہے اک آسمانی راگ ہے — راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

ٹیپو سلطان اور علامہ اقبالؔ

۱۱ر جنوری ۱۹۲۹ء گیارہ بجے دن علامہ اقبالؔ نے ٹیپو سلطان کے مقبرہ گنبد سلطانی پر حاضری دی، جو سری رنگ پٹن میسور میں واقع ہے۔ گنبد سلطانی پر مہاراجہ میسور کرشنا وڈیر کے حکم سے روز آنہ نوبت بجائی جاتی تھی۔ گنبد سلطانی سنگ مرمر، سنگ سیاہ اور سنگ یشیب سے بنائی گئی ہے۔ اس میں موجود تین قبریں اپنی شان و شوکت کی داستانیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ قبریں ٹیپو سلطان شہید، ان کے والد حیدر علی خان اور ان کی والدہ فاطمہ کی ہیں۔ اقبالؔ روضۂ سلطانی کے ایک کتبے کی رباعی پڑھ کر بہت متاثر ہوئے جس میں شہید ٹیپو سلطان کے والدین حیدر اور فاطمہ کے نام کی مناسبت سید الشہدا امام حسین علیہ سلام کے والدین سے تھی۔

آں سید الشہدا عرب سبط نبیؐ = لخت جگر فاطمہؑ و جان علیؑ
از فاطمہ وحیدر دکنی ٹیپو = سلطان شہیداں شد از جان و ولی

علامہ گنبد سلطانی میں شاہی محل کے عہدیداروں، سرکاری افسروں اور عمایدین میسور سے مختصر سلام اور تعارف کرنے کے بعد گنبد میں داخل ہوئے اور اُس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے ٹیپو کے مزار پر تنہا مراقبہ میں گذارے۔ اس عرصے میں تمام عمایدین و عہدہدار اور احباب گنبد سلطانی کے صحن میں اقبالؔ کے منتظر رہے۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد جب علامہ باہر آئے تو اُن کی آنکھیں شدّت گریہ زاری سے سوجھی ہوئی تھیں۔ گنبد سلطانی کے صحن میں مہاراجہ کے درباری موسیقار علی جان نے اپنی دل سوز آواز میں جب علامہ کا کلام سُنایا تو تمام حاضرین پر رقّت طاری ہوگئی۔ علی جان نے یہ حالت دیکھ کر گانا بند کر دیا تو فوراً اقبالؔ نے کہا۔ علی جان کیوں رک گئے خدا کے لئے جاری رکھو۔ چناں چہ کچھ مدّت تک یہ گریہ اور اشک باری کا سلسلہ جاری رہا۔ جب یہ محفل ختم ہوئی تو بنگلور کے مشہور قومی کارکن محمد عباس سیٹھ نے علامہ سے پوچھا۔ آپ نے روضۂ سلطان شہید پر بڑی دیر تک مراقبہ فرمایا ہمیں بھی بتائے کہ مزار سلطان شہید سے آپ کو کیا فیض حاصل ہوا۔ علامہ نے فرمایا مزار پر میرا ایک لمحہ بھی بیکار نہیں گذرا۔ وہاں ایک پیغام الہامی مجھے ملا اور پھر اقبالؔ نے فی البدیہہ یہ فارسی کا

شعر پڑھا۔ ؎ در جہاں نتوان اگر مردانہ زیست ۔ ہمچو مردان جان سپردن زندگیست

(ترجمہ) اگر دنیا میں مردانہ طور زندگی میسّر نہ ہو تو مردانہ وار موت کو آغوش میں لینا خود زندگی ہے۔

علامہ کا یہ شعر ٹیپو سلطان کے اُس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جب اُن کے کسی مصاحب نے ٹیپو کو مشورہ دیا تھا کہ وہ انگریزوں سے صلح کر لیں۔ سلطان شہید نے فوراً کہا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔ علامہ اقبالؔ نے لاہور پہنچ کر اس فی البدیہہ شعر پر چار اشعار کا اضافہ کیا جو اُن کی قلبی واردات تھی۔ یہ اشعار علامہ کے کلیات یا باقیات میں موجود نہیں بلکہ محمود بنگلوری کی کتاب ''تاریخ سلطنت خداداد'' شہاب یزدانی کی کتاب ''گلدستۂ اقبالؔ'' کے غیر مرتب نوادر میں شامل ہیں۔

آتشی در دل دگر بر کردہ ام ۔ داستانی از دکن آوردہ ام

در کنارم خنجر آئینہ فام ۔ می کشم اورا بہ تدریج از نیام

نکتہ ای گویم ز سلطان شہید ۔ زان کہ ترسم تلخ گردد روز عید

بیشتر رفتم کے بوسم خاک او ۔ تا شنیدم از مزار پاک او

در جہاں نتوان اگر مردانہ زیست ۔ ہمچو مردان جان سپردن زندگیست

(ترجمہ۔ میرے دل میں جس چیز نے ایک نئی حرارت پیدا کر دی ہے وہ ایک داستان ہے جو دکن سے لایا ہوں۔ میں اپنے پہلو سے ایک چمکدار تیز خنجر آہستہ آہستہ نیام سے کھینچ رہا ہوں۔ ٹیپو سلطان شہید کا ایک زریں قول کہنا چاہتا ہوں مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں عید کی خوشیاں تلخ نہ ہو جائیں۔ جب میں سلطان کی قبر کو بوسہ دینے لگا تو ان کے مزار سے یہ آواز آئی کہ اگر دنیا میں مردوں کی طرح زندگی کرنا محال ہو جائے تو مردانہ وار جان قربان کر دینا ہی حیات جاوید ہے)

علامہ اقبالؔ نے مولانا رومؔ کے بعد سب سے زیادہ اشعار ٹیپو سلطان شہید پر لکھے اور ان اشعار کو اپنی سب سے اہم کتاب ''جاوید نامہ'' کا جزو بنایا۔ جاوید نامہ کے متعلق محمد جمیل بنگلوری کو ۴؍اگست ۱۹۲۹ء میں لکھتے ہیں۔ ''سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگی جسے میں اپنی زندگی کا ماحصل

بنانا چاہتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں اس کے لئے آپ کو کافی انتظار کرنا پڑے گا''۔

میسور کی سلطنت کا بانی نواب حیدر علی خان کا بڑا بیٹا فتح علی خان جس کو ٹیپو سلطان اولیا کے نام پر ٹیپو سلطان کا نام دیا گیا ۱۵ر نومبر ۱۷۵۰ء میں کولار بنگلور میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۸۲ء میں اپنے باپ کے انتقال پر تخت نشین ہوا۔ ٹیپو سلطان کا تمام دور حکومت انگریزوں، فرانسیسیوں، مرہٹوں اور ان کے ہمدرد سلطنتوں سے لڑائی اور جنگ میں گذرا۔ جب ان تمام قوتوں کو جداگانہ فتح نصیب نہ ہوئی تو سب نے مل کر ٹیپو کے خلاف حملہ آوری شروع کر دی۔ انگریزی فوجیں ٹیپو کے فوجی سپہ سالار میر صادق کی غدّاری سے قلعہ میں داخل ہوگئی اور ٹیپو قلعہ کی مسجد میں لڑتا ہوا ۴ر مئی ۱۷۹۹ء کو شہید ہوگیا۔ ٹیپو سلطان کی تاریخ شہادت قطعہ ''شمشیر گمشدہ'' سے نکلتی ہے۔ دکن کے ایک نامعلوم شاعر نے اِس واقعہ شہادت کی تاریخ ۱۲۱۳ھجری مطابق ۱۷۹۹ء نکالی جس میں نظام حیدر آباد اور اُن کے وزیر آعظم ارسطو جاہ اور اُن کے سپہ سالار میر عالم کے ناموں کے ساتھ انگریزوں کے آلہ کار ہونے کی وجہ سے مسٹر کے عنوان سے لکھّا۔

مسٹر نظام و مسٹر اعظم یزید شد شمر لعین چہ مسٹر عالم پدید شد

تاریخ از شہادت سلطان حیدری ''ٹیپو بہ وجہ دین محمدؐ شہید شد'' (۱۲۱۳) ھجری

اس قطعہ کے آخری مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔

(ترجمہ۔ مسٹر نظام اور اُن کے وزیر آعظم یزید بن گئے۔ ان کے سپہ سالار مسٹر عالم شمر لعین بن کر ظاہر ہوئے اس واقعہ کی تاریخ اس مصرع سے نکلتی ہے کہ ٹیپو سلطان دین محمدؐ کی خاطر شہید ہوگیا)۔

بنگلور کے دورے کے درمیان علامّہ نے آثار سلطانی کی بھی سیر کی۔ سلطان کا قلعہ، مسجد اعلیٰ قلعہ جس میں ٹیپو شہید ہوا تھا، سلطان کا قصر دریا دولت، باغ، میر صادق کی مفروضہ قبر اور غدار لنگڑے غلام علی وغیرہ کی قبر کا بھی دیدار کیا۔ جب کسی نے غدار لنگڑے غلام علی کی قبر پر اس کی تاریخ وفات کا شعر سُنایا تو اقبالؔ پھڑک اٹھے۔

ہیچ می دونی چہ دید از دست او اہل شہید آں چہ اولاد محمدؐ دید از دست یزید

یعنی جانتے ہو ٹیپو کے خاندان کا حال اُس غدار کے ہاتھ سے وہی ہوا جو خاندان محمدؐ کا حال یزید کے ہاتھ سے ہوا)۔

ان مقامات کی سیر سے متاثر ہو کر علامہ نے فرمایا ''مسلمانوں کو مغلیہ سلطنت کے بعد ایک نشاۃ ثانیہ کا موقع ملا تھا لیکن افسوس کہ غداروں نے اُسے بڑھنے نہ دیا''۔

علامہ اقبالؔ کی شعری تخلیقات میں جاوید نامہ کی حیثیت ممتاز اور منفرد ہے جو دو سال کی لگاتار محنت سے ۱۹۳۲ء میں تکمیل کو پہنچی۔ جاوید نامہ کی بابت خود اقبالؔ اپنے خط ۴؍اگست میں فرماتے ہیں۔

''سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگی جسے میں نے اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں۔ جاوید نامہ میں تقریباً ۲ ہزار شعر ہونگے''۔ اسی جاوید نامہ کو علامہ مصور بنانے کے بھی خواہش مند تھے چناں چہ اپنے مکتوب ۳۱؍مارچ ۱۹۳۳ء میں لکھتے ہیں ''اہم کام یہ ہے کہ جاوید نامہ کا تمام وکمال ترجمہ کیا جائے۔ مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کر لینا یقینی امر ہے۔ اگر وہ ترجمے میں کامیاب ہو جائے اور اگر اس ترجمے کو کوئی عمدہ مصور بنا دے تو یورپ اور ایشیا میں مقبول تر ہوگا۔ اس کتاب میں تخیلات نئے ہیں اور مصور کے لئے عمدہ مسالہ ہے''۔ پھر علامہ اپنے ایک اور خط مورخہ ۲۵؍جون ۱۹۳۵ء میں کاظمی کو لکھتے ہیں۔

''میرے خیال میں میری کتابوں میں صرف جاوید نامہ ایک ایسی کتاب ہے جس پر مصور طبع آزمائی کرے تو دنیا میں نام پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے مہارت فن کے علاوہ الہام الٰہی اور صرف کثیر کی ضرورت ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب یہ چیز ایسی شان کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو دنیا یقینی طور پر اس کو کاظمی سکول کے نام سے موسوم کرے گی۔ آپ محض مصوری میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ دنیائے اسلام میں بحیثیت مصوّر اقبالؔ ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جو کہ قدرت شاید آپ ہی سے لینا چاہتی ہے۔ پوری مہارت فن کے بعد آپ نے جاوید نامہ پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہیں گے''۔

اگرچہ ہمارا موضوع اس مضمون میں جاوید نامہ نہیں ہے لیکن اس کا تذکرہ اس لئے لازم ہے کہ اسی

مثنوی میں سلطان شہید ٹیپو کی روداد شامل ہے۔علامہ نے جاوید نامہ کو شیخ محی الدین ابن عربی کے معراج نامے ''فتوحات مکیہ'' عربی نابینا شاعر ابوالعلا المصری کے ''رسالہ زعفران'' اور اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' کو پیش نظر رکھ کر اپنا رویائی سفر کیا ہے یہ اُردو اور فارسی ادب میں بالکل جدید کاوش ہے۔یہ تخیلی خلائی سفر جو حالت خواب میں کیا گیا علامہ اقبال مولانا روم کی قیادت میں چھ افلاک یعنی فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مریخ، فلک مشتری اور فلک زحل کے علاوہ افلاک کے آگے فردوس بریں کی سیر کرتے ہوئے مختلف روحوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں جن میں زرتشت، گوتم، طالطائی، فرعون، ابوجہل، مہدی سودانی، منصور حلاج، ابلیس، نیٹشے، سید علی ہمدانی، شرف النسا، بھرتری ہری، نادر، ابدالی، ناصر خسرو اور ٹیپو سلطان قابل ذکر ہیں۔ اس تخیلی سفر کا نقطہ عروج سلطان ٹیپو سے ملاقات ہے چناں چہ اقبال نے رومی کے بعد ٹیپو سلطان اور ان سے متعلق موضوعات پر سب سے زیادہ اشعار لکھے ہیں جن کی تعداد (۸۰) سے زیادہ ہے۔علامہ کی گفتگو ٹیپو سلطان سے اس سفر کے سب سے آخر میں ہوتی ہے اس کے علاوہ ٹیپو نے جہاں میسور کے دریا کاویری کو زندہ رود کہا وہیں اقبال کو بھی زندہ رود نامزد کیا چناں چہ اس لئے اس تمام مثنوی میں اقبال نے اپنا لقب زندہ رود رکھا۔ملاقات ہوتے ہی ٹیپو سلطان علامہ سے پوچھتے ہیں۔

زائیرے شہر و دیارم بودہ ای　　چشم خود را بر مزارم سودہ ای

ای شناسای حدود کائنات　　در دکن دیدی ز آثار حیات

(ترجمہ۔تم نے میرے شہر اور سلطنت کی سیر و سیاحت کی ہے اور میری قبر پر گریہ زاری بھی کی۔یہ بتاؤ اے دور اندیش دانشمند کیا تم نے وہاں کچھ زندگی کے آثار بھی دیکھے)۔ اقبال نے جواب دیا۔

چشم اشکی ریختم اندر دکن　　لالہ ھا روید زخاک آن چمن

رود کاویری مدام اندر سفر　　دیدہ ام در جان او شوری دگر

یعنی میں نے وہاں آنسوؤں کی تخم ریزی کی ہے اور اب وہاں لالے کی فصل اُگے گی۔وہاں جو دریائے کاویری مسلسل سفر میں ہے۔اس کے بہاؤ میں میں نے ایک نیا شور اور ہیجان دیکھا۔یہ سُن کر ٹیپو

سلطان نے کہا۔

ای ترا دادند حرف دل فروز — از تپ تو می سوزم ہنوز
آن نوا کز جان تو آید برون — می دھد ہر سینہ را سوز درون
بودہ ام در حضرت مولای کل — آنکہ بی اوطی نمی گردد سبل
گرچہ انجا جرات گفتار نیست — روح را کاری بجز دیدار نیست
سوختم از گرمئ اشعار تو — بر زبانم رفت از افکار تو
گفت این بیتی کہ برخواندی زکیست — اندر و ھنگامہ ہای زندگی ست
باھمان سوزی کہ در سازد بہ جان — یک دو حرف از مابہ کاویری رسان
در جہان تو زندہ رود او زندہ رود — خوشترک آید سرود اندر سرود

(ترجمہ۔خدا نے تم کو دلوں کو گرمانے والا سخن عطا فرمایا ہے اسی لئے آنسوؤں کی حرارت مجھے گرما رہی ہے۔تمہارے اشعار سے ہر سینہ روشن ہے۔میں مولا کی خدمت میں تھا جہاں کسی کو بات کرنے کی جرات نہیں ہوسکتی لیکن تمھارے اشعار نے مجھ میں ایسی حرارت پیدا کردی تھی کہ فوراً تمھارا کلام میری زبان پر آ گیا۔مجھ سے پوچھا گیا یہ کس کا کلام ہے جس میں زندگی کے رمز اور ہنگامے پوشیدہ ہیں۔تم اس درد اور کیفیت کے ساتھ میرا یہ خاص پیام دریا کاویری تک پہنچادو کیوں کہ دنیا میں وہ زندہ ندی ہے اور تم بھی زندہ ندی کے مانند ہو چناں چہ کیا خوب ہوگا کہ تم دونوں کے نغمے ایک ہو جائیں)۔

ٹیپو سلطان نے پہلے کاویری کی تعریف کی پھر اپنی درد بھری کہانی سُنائی اور بڑے محکم انداز میں زندگی، موت اور شہادت کے فلسفہ کو موثر انداز میں پیش کیا۔یہ پوری نظم (۴۱) اشعار پر مشتمل ہے جس کے چند اشعار یہاں پیش کئے جارہے ہیں۔

رود کاویری یکی نرمک خرام — خستہ ی شاید کہ از سیر دوام
ای مرا خوش ترز جیحون و فرات — اے دکن را آب تو آب حیات
آہ شہری کو در آغوش تو بود — حسن نوشین جلوہ از نوش تو بود

ای ترا سازی کہ سوز زندگی است　　ہیچ می دانی کہ این پیغام کیست
آنکہ می گردی طواف سطوتش　　بودہ ای آینہ دار دولتش
آنکہ صحرا ھا ز تدبیرش بہشت　　آنکہ نقش خود بہ خون خود نوشت
آنکہ خاکش مرجع صد آرزوست　　اضطراب موج تو از خون اوست
آنکہ گفتارش ہمہ کردار بود　　مشرق اندر خواب او بیدار بود
ای من وتو موجی از رود حیات　　ہر نفس دیگر شود این کائنات
زندگانی انقلاب ہر دمی است　　زانکہ او اندر سراغ عالمی است
درچمن گل مہمان یک نفس　　رنگ و آبش امتحان یک نفس
موسم گل ماتم وہم نای و نوش　　غنچہ در آغوش و نقش گل بدوش
سینہ ای داری اگر در خورد تیر　　در جہان شاہین بزی شاہین بمیر
زندگی را چیست رسم ودین وکیش　　یک دم شیری بہ از صد سال میش
بندہ ی حق ضیغم و آہوست مرگ　　مثلِ شاہینی کہ افتد بر حمام
گر چہ ہر مرگ است بر مومن شکر　　مرگ پور مرتضٰی چیزی دیگر
جنگ مومن چیست ھجرت سوی دوست　　ترک عالم اختیار کوی دوست
کس نداند جز شہید این نکتہ را　　او بہ خون خود خرید این نکتہ را

ترجمہ۔ دریائے کاویری جو آہستہ آہستہ مٹک کر چل رہی ہے شاید مسلسل راہ پیمائی کی وجہ سے تھک گئی ہے۔ یہی کاویری مجھے جیحون اور فرات سے عزیز تر ہے اور اس کا پانی دکن کے لئے آب حیات ہے کاویری وہ شہر جو کبھی تیری گود میں پلا تھا آج کہاں ہے جس کے حسن کا مزہ تیرے شیرین مزے میں شامل تھا۔ اے کاویری تو سراپا سوز زندگی ہے تجھے معلوم ہے یہ کس کا پیام ہے۔ یہ اُس کا پیام ہے جس کی شان اور شوکت کا تو طواف کرتی تھی اور جس کی سلطنت کی تو آئینہ دار تھی۔ جس کی تدبیر اور تدبّر سے دشت بہشت تھی جس نے اپنے خون سے اپنی تاریخ لکھی۔ جس کی گفتار اور کردار یعنی قول اور فعل میں

کوئی تفاوت نہ تھا۔ وہ اس وقت بیدار تھا جب سارا مشرق گہری نیند سو رہا تھا۔ میں اور تو اے دریائے کاویری دریائے زندگی کی دو موجیں ہیں۔ یہاں ہر لحہ کائنات دگرگوں ہوتی رہتی ہے کیوں کہ کائنات حقیقت عالم کی سمت سفر کر رہی ہے اس لئے اس کی زندگی میں ہر لحظہ انقلاب نمودار ہوتا ہے۔ چمن میں پھول ایک سانس کا مہمان ہے اس کی خوبصورتی صرف ایک لحظہ کے لئے ہے۔ اگر تیرا سینہ تیر کھانے کی جرات رکھتا ہے تو شاہین کی طرح زندگی کر اور شاہین کی طرح مرجا۔ زندگی کا دین اور مذہب یہی ہے کہ شیر کی طرح ایک لحظہ جینا بھیڑ کے سو سال جینے سے بہتر ہے۔ اللہ کا بندہ، شیر ہے اور اُس کی موت اس کا شکار ہرن۔ چناں چہ موت اس کے سو مقامات میں سے صرف ایک مقام ہے۔ وہ موت پر اس طرح لپکتا ہے جس طرح شاہین کبوتر پر۔ اگر چہ ہر موت مومن کے لئے شکر سے زیادہ شیریں ہوتی ہے لیکن ابن مرتضیٰؒ کی شہادت کی بات ہی کچھ اور ہے۔ مومن کی جنگ دوست کی سمت ہجرت کا نام ہے۔ یعنی دنیا کو چھوڑ کر کوچہ دوست یعنی خدا کی طرف رخ کرنا ہے۔ اس حقیقت کو صرف شہید جانتا ہے اس لئے وہ اپنا خون دے کر موت اور شہادت کو خریدتا ہے)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبالؔ نے ٹیپو سلطان کو جاوید نامہ کا سرنامہ سخن بنا کر زندہ جاوید کیا اور ٹیپو کی شخصیت اور اس کی شہادت کو مسلمانوں کے جگانے کے لئے موثر طریقہ پر استفادہ کیا اسی لئے جب کسی میجر نے ایک فوجی سکول کو علامہ کے نام سے موسوم کرنے کی اجازت چاہی تو علامہ نے لکھا۔

''ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی سکول کو موسوم کرنا زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس فوجی سکول کا نام ٹیپو فوجی سکول رکھیں۔ ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا''۔

یہی نہیں بلکہ علامہ اقبالؔ ہی کی تحریک اور ترغیب سے ٹیپو سلطان کی سلطنت کے حالات کے مخطوطات اور کتابوں کی طرف توجہ کی گئی اور تاریخ اور ادب میں ایک اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ضرب کلیم میں علامہ کے اُردو میں پانچ اشعار سلطان ٹیپو کے نام سے نظر آتے ہیں جن پر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ اور ڈاکٹر راس مسعود

ڈاکٹر سر راس مسعود ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ وہ جسٹس سید محمود کے بیٹے اور سر سید احمد خان کے پوتے تھے۔ ڈاکٹر راس مسعود نے آکسفورڈ یونی ورسٹی میں تعلیم پائی، پٹنہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے اور بعد میں کنگ کالج میں تاریخ کے پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں حیدر آباد دکن میں ناظم تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے پھر ۱۹۳۴ء میں وائس چانسلری سے استعفیٰ دے کر ریاست بھوپال کے وزیر صحت و تعلیم بنے۔ ڈاکٹر راس مسعود کا (۴۸) سال کی عمر میں اچانک انتقال ہو گیا چناں چہ ۳۱ر جولائی ۱۹۳۷ء کو علی گڑھ میں دفنائے گئے۔ اُن کی لوح قبر پر علامہ اقبالؔ کا یہ قطعہ لکھا گیا جس کو اقبالؔ نے اپنی مزار کے لئے محفوظ رکھا تھا۔

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل　　زبند این و آن آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمی چند　　گلاں را رنگ و آب دادہ رفتم

(ترجمہ۔ میں نے اس چمن میں اپنا دل نہیں لگایا بلکہ ہر بندش سے آزادہ رہ کر چلا گیا ہوں۔
میں نسیم صبح کی طرح تھوڑی دیر سیر کر کے اور پھولوں کو رنگ و تازگی دے کر چلا گیا ہوں)

اگر چہ علامہ اور راس مسعود کے تعلقات بیسوی صدی کے اوائل سے برقرار تھے لیکن ۱۹۲۷ء سے یہ تعلقات گہرے ہو گئے جب وہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں خطبے دینے گئے تھے اور ڈاکٹر مسعود وہاں ناظم تعلیمات تھے لیکن علامہ کا پہلا خط جو راس مسعود کے نام ہے وہ ستمبر ۱۹۳۳ء کا ہے جو افغانستان کی دعوت کے متعلق ہے۔ علامہ کے خطوط ڈاکٹر مسعود کے نام انگریزی زبان میں ہیں۔ علامہ ۲۴ر جون ۱۹۳۵ء کے خط میں ڈاکٹر راس مسعود کو لکھتے ہیں۔ ''آپ کا خط مل گیا اور اعلیٰ حضرت کا والا نامہ بھی وصول ہو گیا جسے ہم نے سادہ اور خوبصورت فریم میں لگوا دیا ہے زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ آپ کے ملنے کے واسطے تڑپ رہا ہوں''۔

علامہ اقبالؔ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء سے ۳۰ نومبر تک عبداللہ چغتائی کے ساتھ علی گڑھ میں رہے اور اس دوران چھ مقالات پڑھے۔ پہلے جلسے میں ڈاکٹر راس مسعود نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشین ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمیٔ محفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبریلؑ نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ ''جب میں یورپ میں بیماری کی وجہ بیمارستان میں داخل ہوا تو صرف اقبالؔ کے اشعار مجھے تسکین قلب دیتے تھے''۔ اسی زمانے میں علی گڑھ یونی ورسٹی نے علامہ کو ادبیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔

ستمبر ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے حکمران نادر شاہ نے علامہ اقبالؔ، سر راس مسعود اور سلیمان ندوی کو افغانستان کے آموزش اور تعلیمی ادارہ جات کی ترقی اور کابل یونی ورسٹی کے قیام کے تعلق سے مدعو کیا چناں چہ افغانستان کے دورہ میں علامہ اور راس مسعود نے نادر شاہ سے ملاقات کے علاوہ کئی تعلیمی اور آموزشی جلسات میں شرکت کی اور افغانی عہدیداروں کو اپنے نقطہ نظر سے واقف کروایا۔ اس سفر کے دوران علامہ اور ڈاکٹر مسعود نے افغانستان کے وزیر آعظم سردار ہاشم خان، وزیر خارجہ نواز خان اور افغانستان کے مشہور شاعر عبدالہ خان سے ملاقات کی۔ ایک بڑے جلسہ میں علامہ اقبالؔ کے بارے میں ڈاکٹر راس مسعود نے کہا۔ ''میرے عزیز دوست اقبالؔ کی شخصیت میں عناصر جدید اور عناصر قدیم کی آمیزش نظر آتی ہے۔ وہ ایک ایسی معجون کے مانند ہے جس کے ذریعے روح کو تقویت اور فکر دانش کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ میں اگر چہ نہ عالم ہوں نہ شاعر لیکن صمیم قلب سے علماً اور شعرا کی عظمت کا قائل ہوں''۔ اقبالؔ، مسعود اور سلمان ندوی نے شہر قدیم غزنین میں حکیم سنائیؔ، سلطان محمود، سلطان مسعود، سلطان ابراہیم اور بہلول دانا کی قبروں پر بھی حاضری دی۔ ڈاکٹر راس مسعود نے ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ کی وائس چانسلری سے استعفیٰ دیا اور بھوپال میں وزیر تعلیم و صحت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اُس زمانے میں حمیدیہ بیمارستان بھوپال میں برقی علاج کی مشینیں لگائی گئیں تھیں چناں چہ علامہ ڈاکٹر مسعود کے اصرار پر علاج کی خاطر بھوپال آئے۔ علامہ ۳۱ر جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال ریلوے اسٹیشن پر پہنچے جہاں اُن کے استقبال کے لئے راس مسعود، ان کے منشی ممنون خان اور بھوپال ریاست کے فوجی عہدیدار جمع تھے۔ ممنون خان بیان کرتے ہیں کہ جب گاڑی اسٹیشن پر رُکی تو اقبالؔ پنجابی قمیص شلوار میں ملبوس افغانی ٹوپی پہنے ہوئے گاڑی سے اُترے تو ڈاکٹر مسعود ان کی طرف دوڑے اور اقبالؔ سے بغلگیر ہو کر اُن کے اس قدر بوسے لئے کہ لوگ حیرت سے دیکھتے رہے۔ ریلوے اسٹیشن سے اقبالؔ

مسعود کے گھر ''ریاض منزل'' پہنچے۔ ممنون خان کہتے ہیں جب میں اقبال کے آرام کرنے کے کمرہ کا جائیزہ لینے گیا تو میں نے دیکھا اقبال کے خدمت گزار علی بخش نے علامہ کا بستر جیسے مہمان کے واسطے ڈاکٹر مسعود نے بچھایا تھا اٹھا دیا ہے اور اُس کی جگہ ایک معمولی بستر جو اقبال لاہور سے ساتھ لائے تھے بچھا دیا جس کے ایک کونے پر دو کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ دریافت کرنے پر علی بخش نے بتایا کہ سفر میں اقبال ہمیشہ اپنے بستر پر سوتے ہیں اور وہ ہمیشہ دیوان غالب اور مثنوی مولوی سفر میں ساتھ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود کی بیگم امتہ المسعود اپنے شوہر کی طرح اقبال کی قدرداں تھیں۔ اسی دوران ایک دن اُمتہ المسعود اور علامہ میں شادی اور رشتوں پر بحث ہوئی جس میں یہ مسئلہ اٹھا کہ لڑکے لڑکیوں کی شادی سے پہلے دوستی اور عشق و عاشقی کی کس حد تک اجازت دینی چاہیے۔ کیا والدین اپنے بچوں کے شریک حیات انتخاب کر سکتے ہیں اور یہ رسومات کس حد تک اسلامی ہیں۔ علامہ اقبال نے بتایا کہ شادی کا اصل مقصد نسل کی برقراری اور اولاد صالح، توانا اور زیبا کا وجود ہے چناں چہ عشق اس رشتے میں اچھی چیز ہے لیکن اُس کی دخالت کی زیادہ ضرورت بھی نہیں۔

علامہ اقبال اور ڈاکٹر راس مسعود میں گہرا یارانہ تھا۔ اگر چہ ڈاکٹر مسعود علامہ سے عمر میں چھوٹے تھے اور اُن کی گہری دوستی زندگی کی آخری دہائی میں ہوئی تھی لیکن اس مختصر مدت کی دوستی نے اُن دراز مدت کی بناوٹی دوستیوں کو پھیکا کر دیا تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ سر راس مسعود اُن گنے چنے افراد میں تھے جو علامہ کو صرف اقبال پکارا کرتے تھے۔ علامہ نے ایک دن مذاق کرتے ہوئے کہا کہ ''مسعود تمھارا دماغ انگریز اور تمہارا دل پکا مسلمان ہے''۔ اُس پر فوراً ڈاکٹر مسعود نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ اُس سے بہتر ہے کہ دماغ مسلمان اور دل انگریز ہو''۔ ڈاکٹر سر راس مسعود بلند قامت، مظبوط بدن اور سفید چہرہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود میں لکھتے ہیں کہ وہ بھوپال کی مسافرت کے دوران ہمیشہ مجھ سے مذاق کرتے تھے۔ بھوپال میں علامہ کے ساتھ جب ایک بار جاوید اقبال بھوپال کی ملکہ کی دعوت پر اُن کے محل گئے تو ملکہ کو دیکھتے ہی اقبال اور راس مسعود سر خم کر کے ایسی تعظیم بجالائے کہ جاوید اپنی ہنسی نہ روک سکے۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ علامہ اقبالؔ کی عالمگیر شہرت اور عوام کی جانب سے پذیرائی نے ان کے کئی قدیم دوستوں کو حسد اور نفرت کی آگ میں غرق کر دیا تھا چناں چہ یہ لوگ بظاہر علامہ کے سامنے ان کی تعریف کرتے لیکن ہمیشہ پشت پردہ علامہ کے خلاف پروپیگنڈہ میں مصروف رہتے جس کی علامہ کو اطلاع تھی اور ان افراد کا ذکر خود جاوید اقبال نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ علامہ نے اکثر ان مسائل کی شکایت اپنے بعض بزرگوں کے خطوط میں اشارے کے طور پر کی ہے۔ ایسے قحط الرجال کے دور میں ڈاکٹر راس مسعود جیسا فرشتہ صفت شخص اقبالؔ کا شیدا تھا اس لئے اقبالؔ راس مسعود سے ملنے کو تڑپتے تھے اور اپنی قلبی کیفیت کو اُن پر ظاہر کرتے۔ حج کی خواہش اور دیارِ محمدؐ کے فراق کا سوز ہمیشہ دل میں ہجوم کئے رہتا چناں چہ جب کبھی مدینہ کا ذکر آتا تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ علامہ کی بینائی بہت کمزور ہو چکی تھی چناں چہ آنکھوں کے علاج سے جب بینائی ذرا بہتر ہوئی تو اپریل ۱۹۳۷ء میں راس مسعود کو لکھا انشا اللہ آئندہ سال حج کے لئے جاؤں گا اور پھر حضورؐ کے دیار کی زیارت سے مشرف ہوں گا اور وہاں سے ایک ایسا ہدیہ اور تحفہ لاؤں گا جو ہمیشہ کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یادگار ہوگا۔ معتبر اسناد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ علامہ نے دسمبر ۱۹۳۷ء یعنی مرنے سے چار مہینے قبل ایک مسافرتی کشتی کمپنی سے حج اور زیارت کے لئے خط و کتابت شروع کی تھی لیکن یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی۔

ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شود

علامہ اقبالؔ ڈاکٹر راس مسعود کو اپنے دونوں صغیر بچوں جاوید اور منیرہ کا سرپرست اور ولی بنانا چاہتے تھے لیکن بعض وجوہات پر ڈاکٹر راس مسعود اس پر راضی نہ ہوئے۔ کون جانتا تھا کہ ڈاکٹر مسعود خود علامہ سے نو مہینے قبل فوت کر جائیں گے۔ علامہ ۳/جون ۱۹۳۷ء یعنی ڈاکٹر مسعود کی موت سے دو مہینے قبل لکھتے ہیں۔ ''مجھے یہ فکر ہے کہ میرے صغیر بچوں کی سرپرستی میرے بعد آپ جیسے افراد کے ہاتھوں میں ہو۔ میں خاندانی افراد سے زیادہ آپ پر اعتماد کرتا ہوں خدا آپ کو حضرت نوحؑ کی عمر عطا فرمائے اور یہ بچے اقبالؔ سے زیادہ آپ کو دیکھیں''۔

اس خط کے ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۵/جون ۱۹۳۷ء کو پھر راس مسعود کو لکھتے ہیں۔ ''وصیت نامہ میں

تیسرے نمبر پر بچوں کا سرپرست بھائی کا لڑکا شیخ اعجاز احمد ہے جو بہت صالح اور اچھا آدمی ہے لیکن متاسفانہ وہ قادیانی مسلک کا پابند ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ شخص جس کا عقیدہ ایسا ہو کس طرح سے مسلمان بچوں کا سرپرست ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ لاہور کے باہر زندگی کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں اُس کی جگہ آپ کا نام رکھ دوں۔ مجھے امید ہے کہ اس بابت آپ کو اعتراض نہ ہوگا"۔

علامہ اقبال کی صحت خراب اور مالی طاقت کم اور اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ مالی بحران سے دوچار اور پریشان تھے۔ جب جاوید کی والدہ سردار بیگم کا انتقال ہوگیا تو علامہ نے ۱۲ر مئی ۱۹۳۵ء میں راس مسعود کو لکھا۔ "میری یہ خواہش ہے کہ اعلیٰ حضرت بھوپال مجھے تاحیات وظیفہ دیں تاکہ میں اطمینان کے ساتھ قرآن مجید کے متعلق ایسی کتاب لکھوں جس کی نظیر نہ مل سکے اور وہ کتاب مجھے زندہ جاوید رکھے۔ ایسی کتاب اسلام کی بڑی خدمت تصوّر کی جائے گی۔ جب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس زمانے میں دنیائے اسلام میں صرف میں وہ تنہا شخص ہوں جو اس کام کو انجام دے سکتا ہوں تو میں خود ستائی نہیں کر رہا ہوں"۔ سر راس مسعود کی کوششوں سے والیٔ بھوپال نے علامہ کو ہر مہینے پانچ سو روپئے کا وظیفہ تاحیات مقرّر کیا جس کا شکریہ علامہ نے تحریر اور اشعار کے ذریعہ ادا کیا۔

اس مالی مدد سے ڈاکٹر راس مسعود مطمئن نہ ہوئے اور وہ دوسری ریاستوں جن میں حیدرآباد دکن اور بہاول پور شامل تھے علامہ کے لئے وظائف حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن علامہ نے ان کو منع کیا اور ۱۱ر ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط میں لکھا۔ "جو مالی مدد اعلیٰ حضرت بھوپال نے کی ہے وہ میرے لئے کافی ہے میں امیرانہ زندگی کی عادت نہیں رکھتا کیوں کی اچھے مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی گزاری ہے ضروریات زندگی سے زیادہ کی حوس حرص اور لالچ ہوتی ہے جو مسلمان کی شایان شان نہیں۔ پھر اس خط کو پڑھنے کے بعد آپ کو اس لئے تعجب ہوگا کہ آپ جن بزرگوں کی اولاد ہیں انھوں نے ہمیشہ قناعت اور سادگی میں زندگی بسر کی ہے"۔

علامہ ۲۹ر جون ۱۹۳۶ء کو ڈاکٹر راس مسعود کو لکھتے ہیں کہ "تیسری اپریل کی رات جب شیش محل بھوپال میں سو رہا تھا میں نے خواب میں آپ کے دادا سر سید احمد خان کو دیکھا تو انھوں نے کہا اپنی

بیماری کی حضور رسالت مآب سے شفا طلب کرو، چناں چہ اُسی حالت میں بیدار ہو کر چند اشعار نظم کئے تھے اور لاہور پہنچ کر ان اشعار کو تکمیل کیا جو فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' کا حصہ ہوں گے۔

اس مثنوی کا عنوان "در حضورِ رسالت مآب" ہے جو (۶۲) اشعار پر مشتمل ہے جس کے ایک شعر پر ہم اس مضمون کو تمام کرتے ہیں۔

؎ با پرستاران شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

(ترجمہ۔ میں تاریکی پھیلانے والوں سے لڑ رہا ہوں، کچھ اور تیل میرے چراغ میں ڈال دے)

سپاس جناب امیرؑ

علامہ اقبالؔ کا وظیفہ

مدیر مخزن بیرسٹر عبدالقادر نے مخزن ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبالؔ کی یہ چونتیس (۳۴) شعر کی نظم ''سپاس جناب امیرؑ'' کو اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ ''ذیل کی نظم درج کر کے آج ہم اُن احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں جو پروفیسر اقبالؔ صاحب کے فارسی کلام کے لئے اکثر دفعہ بے حد اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں۔ فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں تاہم احباب کے اصرار پر ہم اِسے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم با اظہار عقیدت شیخ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں''۔ اس نظم کو مرحوم تصدق حسینؒ تاج نے ۱۹۳۸ء میں احمدیہ پریس چار مینار سے شائع کیا جس کی ایک کاپی ان کے فرزند جناب احمد حسین نے راقم کو عنائیت کی ہے۔ یہ نظم ۱۹۵۷ء جنوری کے رضا کار لاہور میں بھی شائع کی گئی۔ اِسی نظم کے تیرہ (۱۳) اشعار علامہ نے عشق کے عنوان پر اپنے فارسی کلام میں شائع کئے اور پوری نظم باقیات اقبالؔ میں موجود ہے۔ علامہ اقبالؔ نے کبھی بھی عوام کے سامنے اپنے آپ کو مذہبی، متقی اور پرہیزگار ظاہر کرنے کی کوشش نہ کی۔ اگر قرآن کی تلاوت، نماز کی پابندی یا نماز تہجد کا ذکر کیا تو وہ بھی ایک غیر مسلم دوست مہاراجہ کشن پرشادؔ کے خصوصی خطوط میں۔ علامہ کی مذہبی زندگی اور ان کے عبادات کے حالات ہمیں ان کے خادم علی بخش، ان کے قریبی رشتے دار اور بے تکلف دوستوں کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں علامہ عبادت میں خلوت پسند تھے شاید اِسی لئے اس دورنی قلبی وارادات کو اپنے مجموعہ کلام کا جزو نہیں بنایا۔ کیوں کہ اس سے ان کے جذبات اور دلی کیفیات کا دریا اُبلتا نظر آتا ہے۔

اس نظم کے ۳۴ اشعار ترجمے کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اے محو ثنائے تو زبان ہا اے یوسفؑ کاروان جان ہا

(زبانیں آپ کی تعریف میں مصروف ہیں۔ آپ جانوں کے قافلے کے یوسفؑ یعنی سردار اور پیشوا ہیں)۔

۲ اے باب مدینہ محبت اے نوحؑ سفینہ محبت

(آپ (علیؑ) شہر محبت کے دروازے اور محبت کی کشتی کے نوحؑ ہیں)

اس شعر میں دو معروف حدیثوں کی طرف اشارہ ہے۔

۳ اے ماحی نقش باطل من اے فاتح خیبر دل من

(آپ میرے باطل افکار کو مٹانے والے یعنی صحیح راہ دکھانے والے ہیں اور آپ میرے دل کے قلعہ خیبر کو فتح کرنے والے ہیں تا کہ میرے دل میں کفری امنگوں کا خاتمہ ہو جائے)۔

۴ اے سرّ خط وجوب وامکاں تفسیر تو سور ہائے قرآں

(آپ واجب الوجود (خدا) اور ممکن الوجود (بندے) کے درمیان رشتہ قائم کرنے والے خط مستقیم ہیں۔ قرآن کے سوروں میں آپ کی تعریف موجود ہے)۔

۵ اے مذہب عشق را نمازی اے سینۂ تو امین رازی

آپ عشق کے مذہب کی نماز ہیں اور آپ کے سینے میں راز الٰہی چھپا ہوا ہے)۔

۶ اے سرّ نبوت محمدؐ اے وصف تو مدحت محمدؐ

(آپ نبوت محمدؐ کے راز داں ہیں آپ کی تعریف یعنی محمدؐ کی تعریف ہے)۔

۷ گردوں کے بہ رفعت استادہ است از بام بلند تو فتادہ است

(آسمان جو بلندی پر قائم ہے آپ کے بام کی بلندی سے نیچے ہے یعنی آپ کا مقام آسمانوں سے بلند و بالا ہے)۔

۸ ہر ذرّہ در گہت چو منصور در جوش ترانۂ انا الطور

(آپ کی درگاہ کا ہر ذرّہ جوش میں آ کر میں کوہ طور ہوں نغمہ سرائی کرتا ہے)۔

۹ بے تو نتواں با و رسیدن بے او نتوان بتور رسیدن

(اے علیؑ آپ کی معرفت بغیر کوئی خدا تک نہیں پہنچ سکتا اور خدا کے کلام کے سمجھے بغیر کوئی آپ تک نہیں پہنچ سکتا)۔

۱۰ فردوس ز تو چمن در آغوش از شان تو حیرت آئینہ پوش

(آپ کی وجہ سے جنت پُر بہار ہے اور آپ کی شان دیکھ کر خود حیرت دنگ ہے)۔

۱۱ جانم بہ غلامی تو خوش تر سر بر زدہ ام ز حبیب قنبر

(مجھے آپ کی غلامی پسند ہے مجھے آپ کے غلام قنبر کی نسبت حاصل ہو جائے)

۱۲ ہشیارم و مست بادۂ تو چوں سایہ ز پا فتادۂ تو

(میں آپ کی محبت میں سرشار اور ہوشیار ہوں اور آپ کے قدموں پر سایے کے مانند پڑا ہوں)۔

۱۳ از ہوش شدم مگر بہ ہوشم گوئی کہ نصیری خموشم

(میں ہوش کھو کر بھی ہوش و حواس میں ہوں یعنی ایک نصیری کی طرح خاموش زندگی بسر کر رہا ہوں)۔

۱۴ دائم کہ ادب بہ ضبط راز است در پردۂ خامشی نیاز است

(مجھے علم ہے کہ عشق کے راز کو چھپانا چاہیے اور نیاز محبت کو خاموشی کے پردوں میں رکھنا چاہیے)۔

۱۵ لیکن چہ کنم مئے تولا تند است بروں فتد زمینا

(مگر کیا کروں آپ کی محبت کی شراب ایسی تیز ہے کہ دل کی بوتل سے ہونٹوں پر اُبل پڑتی ہے)۔

۱۶ زاندیشۂ عاقبت رہیدم جنس غم آلؑ تو خریدم

(مجھے اپنی عاقبت کا خیال ہے اسی لئے تری اولاد کا غم مول لیا ہوں)۔

۱۷ فکرم چو بہ جستجو قدم زد در دیر شد و در حرم زد

(میرے فکر نے جب جستجو شروع کی تو کبھی مندر اور کبھی کعبہ کے دروازے کھٹکھٹائے)۔

۱۸ در دشت طلب بسی دویدم داماں چو گرد باد چیدم

(میں دشت طلب میں بگولے کی طرح سرگرداں رہ کر کہساروں کے دامانوں سے چیزیں جمع کیا ہوں)۔

۱۹ در آبلہ خار ہا خلیدہ صد لالہ تہ قدم دمیدہ

(تب جا کر میرے پاؤں میں چھالے اور ان میں کانٹے ٹوتے اور قدموں کے نیچے اتنا خون بہا کہ سینکڑوں لالہ ظاہر ہوئے)۔

۲۰ افتادہ گرہ بروے کارم شرمندۂ دامن غبارم

(میرے کاموں میں رکاوٹیں آئیں اور میں سرتاپا گردوغبار میں بھر گیا)۔

۲۱ پویاں پئے خضر سوئے منزل بردوش خیال بستہ محمل

(میں خیال کے کاندھوں پر اپنا محمل سفر باندھ کر خضر (رہنما) کے پیچھے منزل کی طرف چلتا رہا)۔

۲۲ جویاے مئے و شکستہ جامی چون صبح بہ یاد چیدہ دامی

(میں مئے ولا کا خواستگار لیکن میرا جام ٹوٹا ہوا تھا اُسی طرح سے کی صبح جو نسیم سحر سے محروم ہو)۔

۲۳ پیچیدہ بہ خود چو موج دریا آوراہ چو گرد باد صحرا

(میں دریا کی موجوں کی طرح پیچ وتاب کھاتا اور صحرا کے بگولوں کی طرح آوارہ پھرتا تھا)۔

۲۴ واماندہ زدرد نارسیدن در آبلۂ شکستہ دامن

(پیروں کے چھالوں کے درد سے منزل تک پہنچنا ناممکن نہ تھا)۔

۲۵ عشق تو دلم ربود ناگاہ ازکار گرہ کشود ناگاہ

(آپ کی محبت نے دل کو تھاما اور جو میرے کام میں گرہ پڑ گئی تھی اس کو کھول دیا)۔

۲۶ آگاہ زہستی وعدم ساخت بت خانہ عقل را حرم ساخت

(مجھے ہستی اور نیستی کے رازوں سے آگاہ کیا اور عقل کے بت خانہ کو کعبہ بنا دیا)۔

۲۷ چوں برق بجز منم گزر کرد از لذّت سوختن خبر کرد

وہ برق کی طرح مجھ میں گزری اور عشق میں جلنے کی لذّت سے آشنا کر گئی)

۲۸ برباد متاع ہستم داد جامے زمئے حقیقت ام داد

(جس نے میرے ہستیٔ مجاز کو برباد کر کے مجھے حقیقت سے بھرا ہوا ساغر عطا کیا)۔

۲۹ سرمست شدم زپا فتادم چوں عکس زخود جدا فتادم

(میں اس قدر مست ہوا کہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا اور اپنی ذات سے جدا ہو کر رہ گیا)۔

۳۰ پیراہن ماومن دریدم چوں اشک زچشم خود چکیدم

(میں نے خودی کا لباس پھاڑ ڈالا اور آنسو کی طرح اپنی ذات سے ٹپک گیا)۔

۳۱ خاکم بہ فراز عرش بردی زاں راز کہ بادلم سپردی

(آپ نے مجھے رازوں سے آگاہ کر کے میری منزلت کو عرش تک پہنچا دیا)۔

۳۲ واصل بہ کنار کشتی ام شد طوفان جمال زشتیم شد

(میری کشتی کنارے سے لگ گئی اور طوفانی موجوں سے میرے بدصورتیاں حسین ہو گئیں)۔

۳۳ جز عشق حکایتی ندارم پروائے ملامتی دارم

(عشق کے قصہ کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا۔ لوگوں کی طعن کی بھی پروا نہیں کرتا)۔

۳۴ از جلوۂ عام بے نیازم سوزم گریم تپم گدازم

(میں حسن کے جلوے عام سے بے نیاز ہوں کیوں کہ میں نے تیرا صحیح عشق حاصل کر لیا ہے جس میں خود جلتا ہوں، روتا ہوں، تڑپتا ہوں اور گھلتا ہوں)۔

علامہ اقبال اور مسئلہ فلسطین

علامہ اقبال کی مسئلہ فلسطین سے گہری وابستگی پہلی جنگ عظیم سے نظر آتی ہے۔ فلسطین کا مسئلہ تمام عمر اُن کی شاعری اور گفتگو کا موضوع بھی رہا۔ اس مسئلہ پر پہلی مستند تحریر علامہ کے خط مورخہ ۲۹ فبروری ۱۹۲۲ء میں نظر آتی ہے جس میں مولانا گرامی کو لکھتے ہیں۔ ''ترکوں کے ساتھ اتحادیوں کا جو عہد نامہ ہوا تھا اس کی رُو سے مقامات مقدسہ فلسطین وشام کے لئے ایک کمیشن مقرر ہونے والی ہے۔ جس کے ممبر مسلمان، عیسائی و یہود ہوں گے۔ گورنمنٹ نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ آیا میں اس کمیشن کا ممبر بننا قبول کر سکتا ہوں۔ اس کمیشن کے اجلاس مقام یروشلم میں ہوں گے اور دو تین سال میں معتدد بار یہاں سے یروشلم جانا پڑے گا۔ بعد کامل غور آج میں نے فیصلہ کر دیا ہے کی میں اس میں شریک نہیں ہو سکتا''۔ علامہ نے جس کمیشن کا ذکر کیا اُس کے بارے میں '' سروے آف انٹرنیشنل افیرز (Survey of International Affairs) ۱۹۲۵ء میں تحریر ہے کہ ''دفعات انتداب کے مطابق فلسطین کے مقامات مقدسہ کے سلسلے میں جو مسیحوں، مسلمانوں اور یہودیوں کے نزدیک یکساں مقدس ہیں پوری ذمہ داری انتدابی مملکت نے سنبھال لی ہے اور وہ اس معاملے میں صرف جمیعت اقوام کے روبرو جواب دہ ہو گی۔ ایک کمیشن اس غرض سے مقرر کیا جائے کہ وہ مقامات مقدسہ کے متعلق فلسطین کی تمام مذہبی ملتوں کے حقوق و دعاوی کا مطالعہ کرے، ان کی حد بندی اور تعین کر دے۔ یہ کمیشن انتدابی مملکت مقرر کر دے گی۔ کمیشن کے ارکان کی نامزدگی کا طریقہ، کمیشن کی ہیئت ترکیبی اور اس کے وظایف جمیعت اقوام کی کونسل سے منظور کرائے جائیں گے''۔

اس کمیشن میں شریک نہ ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے ۲۲ فبروری ۱۹۲۲ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں۔ ''یہ رائل کمیشن ہو گی اور رائل کمیشن کے ممبروں کے قاعدے کی رو سے سوائے اخراجات سفر کے اور کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ چون کہ میں دولت مند آدمی نہیں اور یہ کام قریباً دو سال جاری رہے گا اور اجلاس کے لئے ہر سال فلسطین جانا پڑے گا اس واسطے مجبوراً بادلِ ناخواستہ مجھے انکار کرنا پڑا''۔ بہر حال علامہ نے حکومت برطانیہ کو اپنے نفی کے جواب سے مطلع کیا مگر بعد میں حالات کچھ

ایسے بدلے کہ یہ کمیشن بن ہی نہ سکا۔

حکومت برطانیہ کے سابق وزیر آعظم لارڈ بالفور (Lord Balfour) نے نومبر ۱۹۱۷ء میں ایک اعلان شائع کیا تھا جس میں یہودیوں کو یہ اطمینان دلایا گیا تھا کہ سرزمین فلسطین کو ان کا صہیونی ملک بنایا جائے گا۔ چنان چہ اس اطلاعیہ کے بعد دنیا بھر کے یہودی جوق در جوق فلسطین میں وارد ہوئے اور اُنھوں نے مسجد اقصیٰ کے ایک حصّہ پر قبضہ حاصل کیا جس کی وجہ سے عرب اور یہودیوں کے تعلقات بہت خراب ہو گئے اور حکومت برطانیہ کی مدد اور بے پناہ طرفداری سے ہزاروں فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔ انہی تشویش ناک حالت اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کے اعتراض میں ۷/دسمبر ۱۹۲۹ء کو ایک بڑا جلسہ لاہور کے دہلی دروازے کے قریب منایا گیا جس میں علامہ اقبالؔ نے فرمایا۔ ''فلسطین میں مسلمانوں ان کے بچوں اور عورتوں کو شہید کیا جا رہا ہے اور یہ قتل و غارت مسجد اقصیٰ کے پاس کیا جا رہا ہے جو مقام معراج رسولؐ خدا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہودیوں کو فلسطین پر کوئی قانونی یا تاریخی حق حاصل نہیں''۔

۱۹۱۴ء میں انگریزوں نے اپنی سیاسی فائدہ کی خاطر یہودیوں کو آلہ دست بنایا چناں چہ یہودیوں نے یہ ادّعا کیا ہے کہ مسجد اقصیٰ کا ایک حصّہ اُن سے متعلق ہے اسی لئے اس کو حاصل کرنے کے لئے فتنہ و فساد برپا کیا اور مسلمانوں کو ان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بھیڑیوں کی طرح ذبح کیا ہے۔ اسی لئے مجلس عالی فلسطین نے یہ اعلان کیا ہے کہ یہودیوں کی یہ حرکتیں مسلمانوں کے لئے بہت بُرے نتائج کی حامل ثابت ہونگیں۔ اقبالؔ مغربی سیاسیات پر یہودیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو سمجھ گئے تھے اُن کا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن یورپ ان کے دام فریب کا شکار ہو کر رہے گا۔

تاک میں بیٹھے ہیں مدّت سے یہودی سود خوار　　جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکّے ہوئے پھل کی طرح　　دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

علاّمہ اپنی دوسری نظم ''یورپ اور یہود'' میں اسی خیال کی عکاسی فرماتے ہیں۔

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ　　شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

فلسطین کے مفتی اعظم سید امین الحسینی نے اتحاد عالم اسلام اور فلسطین کے مسائل پر غور کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۳۱ء میں بیت المقدس میں ایک موتمر بلائی اور علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا۔ اس کانفرس میں مولانا شوکت علی کے علاوہ عراق سے کاشف الغطا مجتہد العصر نجف اشرف مصر سے محمد علی علویہ اور ایران سے سید ضیا الدین طباطبائی قابل ذکر تھے۔

جاوید اقبال زندہ رود میں لکھتے ہیں کی ۶/ڈسمبر ۱۹۳۱ء صبح ساڑھے نو بجے اقبال بیت المقدس پہنچے۔ بارش شدید ہونے کے باوجود اسٹیشن پر مفتی اعظم سید امین حسینی اور دوسرے کارکنان کانفرس خیر مقدم کے لئے موجود تھے۔ اس کانفرس میں مفتی اعظم کو صدر، محمد علی پاشا، علامہ اقبال اور ضیا الدین طباطبائی کو نائب صدر انتخاب کیا گیا۔ علامہ اقبال ۷/ڈسمبر سے ۱۴ڈسمبر تک مختلف جلسوں اور تشکیلاتی کمیٹوں میں شامل ہوئے اور اپنے گراں قدر خیالات سے اتحاد بین المسلمین اور مسئلہ فلسطین کو سنوارتے رہے۔ علامہ نے حجاز کی ریلوے لائین کے بارے میں کہا کہ یہ ریلوے لائین مسلمانوں سے متعلق ہے اور اُسے غیر اسلامی ملکیت سے خارج کیا جائے۔ فلسطین کے مقامات مقدسہ کے بارے میں اقبال نے مسلمانان عالم کو مشورہ دیا کہ وہ یہودیوں کا مالی بائیکاٹ کریں اور یہودیوں کو فلسطین میں داخل ہونے اور صیہونی حکومت بنانے سے روکیں اس کے علاوہ وہ ''دیوار گریہ'' پر یہودیوں کے حق کے بھی مخالف تھے۔ علامہ اقبال نے ۱۴/ڈسمبر ۱۹۳۱ء کو عصر کے وقت انگریزی میں وداعی خطبے میں کہا کہ ''مجھے سخت افسوس ہے کہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے کانفرس کے اختتام تک نہیں رہ سکتا لیکن میری یہ آرزو ہے کہ اس سرزمین انبیاء اور مقامات مقدسہ کی دوبارہ زیارت کروں۔ آج کل اسلام کو دو بڑے خطرے گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک کمینوزم اور دوسرے وطن اور قوم پرستی۔ یہ ہمارا وظیفہ ہے کہ ہم ان دونوں گمراہ طاقتوں کا مقابلہ کریں۔ میں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ ہم دل سے مسلمان ہوں۔ میں اسلام کے دشمنوں سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں سے خوف زدہ ہوں''۔ ایرانی وفد کے سربراہ آقا ضیاء الدین طباطبائی لکھتے ہیں کہ ''میں علامہ کی تقریر کا عربی میں ترجمہ کر رہا تھا لیکن جب علامہ نے فی البدیہہ تین فارسی کے اشعار پڑھے تو سامعین پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا اور یہ آبدار اشعار دل میں ایسے پیوست

ہوئے کہ ان کا ترجمہ میرے لئے جو خود فارسی زبان تھا مشکل ہو گیا''۔ علامہ نے جو فارسی کے اشعار پڑھے وہ یہ تھے۔

طارق چو بر کنارہ ی اندلس سفینہ سوخت　　گفتند: کار تو بہ نگاہ خرد خطاست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم　　ترک شعیب ز رو شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر بردو گفت　　ہر مُلک مُلک ماست کہ مِلک خدائے ماست

ترجمہ۔ طارق نے جب اندلس کے کنارے پر اپنی کشتیاں جلا ڈالیں تو لوگوں نے کہا کہ عقل کی نظر سے یہ کام غلط تھا۔ ہم وطن سے دور ہیں اور شریعت میں گھر کو چھوڑنا جائیز بھی نہیں۔ طارق مسکرایا اور شمشیر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ دنیا کا ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا کی ملکیت ہے)۔

علامہ اقبالؔ نے اپنی اقامت کے دوران فلسطین میں مقامات مقدسہ کی زیارت کے علاوہ فلسطین کے یتیم خانہ، حضرت عیسیٰؑ کے محل ولادت اور فلسطین کے اکابروں اور نوجوانوں سے ملاقاتیں کیں۔ علامہ نے فلسطینی نوجوانوں کو باعزم اور انقلابی دیکھ کر انھیں سراہا چناں چہ اسی جوش و خروش کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ نے انھیں نصیحت کی کہ مغربی اقوام سے کسی قسم کے انصاف کی توقع رکھنا عبث ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خداوخودی کو رہنما بنا کر کھوئے ہوئے فلسطین کو دوبارہ حاصل کیا جائے۔

تری دوا نہ جینوا میں ہے نہ لندن میں　　فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے
سُنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات　　خودی کی پرورش و لذّت نمود میں ہے

فلسطین کانفرس کے وداعی خطبے میں اقبالؔ نے بڑی تاکید کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل اتحاد پر موقوف ہے جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام بھی کامیاب ہو جائے گا۔ ہم سب پر واجب ہے کہ اس باب میں ساری قوتیں صرف کر دیں''۔ مسئلہ فلسطین پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ نے مس فارتو ہرسن کو لکھا۔

''فلسطین پر یہودیوں کا بھی کوئی حق نہیں۔ یہودیوں نے تو اس ملک کو رضامندانہ طور پر عربوں کے فلسطین پر قبضہ سے بہت پہلے خیرباد کہہ دیا تھا۔ صیہونیت بھی کوئی مذہبی تحریک نہیں۔ علاوہ اس امر کے

مذہبی یہودیوں کو صیہونیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ خود فلسطین رپورٹ نے اس امر کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے''۔ علامہ جانتے تھے کہ حکومت برطانیہ فلسطین پر یہودیوں کا حق ثابت کرنے کے لئے یہ پروپگنڈہ کر رہے ہیں کہ عربوں نے یہودیوں کو فلسطین سے نکالا تھا اس لئے یہ سرزمین اُن کو واپسی دلانا مناسب ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اس خیال کو غلط ثابت کر کے یہ سوال اٹھایا کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے تو عربوں کا حق اسپین اور سسلی اور دوسرے یورپین مفتوحہ علاقوں پر کیوں نہیں ہو سکتا ہے۔ یہودیوں کا دعویٰ ایسا ہی ہے، جیسے ریڈ انڈین امریکہ پر اور ہُن گاتھ اور گال قومیں برطانیہ پر دعویٰ کر دیں۔ ہزار سال دستر برداری اور خاموشی کے بعد یہودیوں کا نیا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے اور اس کے پیچھے مغرب کا ہاتھ ہے۔

ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور قصّہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا

اقبالؔ اپنی تمام زندگی فلسطین عوام کے ساتھ جہاد بالقلم میں مصروف رہے۔ جب ۱۹۳۳ء میں حکومت برطانیہ نے فلسطین میں ایک حکومت ملّی یہودیوں کے زیر نگرانی بنانے کا اعلان کیا تو اُسی سال ۶ نومبر کو اقبالؔ نے حکومت برطانیہ کے وزیر اعظم کو ٹیلیگراف بھیجا کہ ''فلسطین کے حالات سے ہندوستانی مسلمان میں تشویش اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے چونکہ برطانیہ کی سیاست یہ ہے کہ عربوں کے فائدے کے خلاف فلسطین میں یہودیوں کی حکومت برقرار کرے یہ سیاسی دشمنی جو مسلمانوں کے ساتھ کی جا رہی ہے فوراً ختم کی جائے اور بالفور کے اجنڈے کو واپس لے لیا جائے تا کہ مسلمانوں اور حکومت برطانیہ کے تعلقات اس سے بدتر نہ ہوں''۔ علامہ نے اس طرح کا ایک ٹیلگرام حکومت برطانیہ کی پارلمنٹ کو بھی بھیجا۔ جب جولائی ۱۹۳۷ء میں حکومت برطانیہ نے فلسطین کی تقسیم کا اعلانیہ منتشرہ کیا تو علامہ بہت رنجیدہ اور مضطرب ہوئے چنان چہ مسلم لیگ سے خواہش کی کہ فوراً لاہور میں جلسہ عمومی تشکیل دیا جائے چناں چہ ۱۲ جولائی ۱۹۳۷ء موچی دروازے کے باغ میں جناب ملک برکت علی کی صدارت میں ایک عظیم جلسہ منایا گیا اور علامہ اقبالؔ کا خطبہ پڑھا گیا جو اُن کے مرنے